

آتشکدہ

تاثیر

شاعری سے عشق کرنے والوں کے نام —— !

فہرس

تاثیر میری نظر میں

تاثیر اور میں کالج میں ہم جماعت تھے۔ آج جب میں اس زمانے کا تصور کرتا ہوں تو تاثیر کی تصویر یوں میرے سامنے آتی ہے:۔ دبلا پتلا جسم، بڑا سر، سادہ لباس۔ لیکن آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور باتوں میں شوخی اور ظرافت، ہم جماعتوں میں اسکی محنت اور پڑھائی کا چرچا تھا۔ اور احباب اسکی دوستی کا دم بھرتے تھے۔

میں کالج سے فارغ ہوا تو ولایت چلا گیا۔ اور تاثیر اسلامیہ کالج میں پڑھانے لگا۔ میں ولایت سے واپس آیا تو تاثیر ادھر روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی پر بھی میری اس کی ملاقات بہت کم ہوئی۔ وہ امرتسر اور لاہور میں رہا اور میں لاہور سے دور مختلف مقامات میں گھومتا رہا۔ اسی اثنا میں تاثیر کا نام ادبی حلقوں میں چمکنے لگا۔ رسالوں میں اس کے مضمون اور نظمیں چھپتی تھیں، علمی اور ادبی حلقوں میں اس کا اکثر ذکر ہوتا تھا۔ صاحب ذوق لوگ مشاعروں میں اس کے شعر پڑھنے کے انداز پر تبصرہ کرتے اور اس کے پرزور مضامین کی داد دیتے۔ وقتاً فوقتاً اس کی لکھی ہوئی کوئی نہ کوئی چیز میری نظر سے بھی گزرتی اور بے ساختہ دل میں ایک ولولہ سا پیدا ہوتا اور اس شاعر، ادیب اور نقاد دوست سے بے تکلف ملنے اور زیادہ دیر تک قریب رہنے کو جی چاہتا۔ لیکن ملازمت کے جھمیلے ہمیشہ آڑے آتے اور ایسی ملاقات کی آرزو دل میں چٹکیاں لے کر رہ جاتی ؛

آخر ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد میں اور تاثیر دلی اور شملے میں جمع ہو گئے۔ تاثیر اب بھی میرا وہی ہم جماعت تاثیر تھا لیکن ادب و شعر اور درس و تدریس سے اس کے خط و خال سنور گئے تھے۔ زیادہ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ تاثیر خالی شاعر اور ادیب ہی نہیں ایک ہوش مند، تجربہ کار انسان بھی ہے۔ اس کی باتوں میں فقط شوخی اور رنگینی ہی نہیں باریک بینی اور گہرائی بھی ہے اور وہ ادب کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بھی

آشنا ہے۔ اور پھر اس میں محبت کی گرم جوشی بھی ہے۔ اس کے پاس رہنے سے دوستی کا مزہ آتا ہے۔ اور اس سے الگ ہو جانے سے جدائی کی تلخی محسوس ہوتی ہے

پاکستان کے قیام کے بعد مجھے صوبے کا ناظم تعلیمات بنایا گیا۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ حالات اتنے موافق نہیں تھے کہ انسان آسانی کے ساتھ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو سکتا۔ اس انقلاب سے بیسیوں ناگوار حالات پیدا ہوئے، طبیعتوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ حالات پر آسانی سے قابو پا سکتیں۔ ایسے نازک مرحلے پر آئندہ کیلئے سوچنا اور کوئی تعمیری پروگرام بنانا آسان کام نہ تھا۔ اور پھر نظام تعلیم کو نئی شکل دینا، اور پاکستانی ماحول اور نصب العین کے مطابق سنوارنا اور بھی مشکل تھا۔ بلاشبہ تعلیمی وزارت کی سرپرستی، اسکی مفید ہدایات میرے شاملِ حال تھیں۔ لیکن تاثیر کی صحبت اور دوستی میرے لئے نعمت ثابت ہوئی ؎

صوبے میں نظام تعلیم کو نئے سرے سے ترتیب دینے کا کام شروع ہوا۔ اور اس کے لئے محکمے کی طرف سے تعلیم کے ماہرین کی کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ ان کمیٹیوں میں تاثیر بھی شریک تھا۔ سب نے اپنی استعداد، مطالعہ اور تجربے کے مطابق اس مبارک کوشش میں حصّہ لیا۔ لیکن تاثیر کے سوچنے اور معاملات پر غور کرنے کا انداز سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہ تعلیم کے مسئلے کو چند نصاب کی کتابوں اور تدریسی طریقوں تک محدود نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے قوم کی ساری زندگی تھی۔ اور اس کا مستقبل تھا۔ اس بارے میں اسکی نظر بڑی وسیع تھی۔ جب کبھی بھی کسی تعلیمی مسئلے پر میری اس سے گفتگو ہوئی تو اس نے یہی کہا کہ تعلیم کا تعلق خالی مدرسوں اور کالجوں کی چار دیواری سے نہیں، یہ چیز قوم کی مجموعی زندگی پر حاوی ہے۔ تعلیم کا تعلق قوم کے ادب، اس کے مختلف فنون اور تہذیب سے ہوتا ہے۔ اس لئے اِن میں گہرا رابطہ ہونا چاہیے تاکہ تعلیم اور تہذیب کے قدم ایک ساتھ اُٹھ سکیں ؎

ملک میں تجربہ کار اُستاد اور ماہرین تعلیم ہیں مگر بہت کم۔ تاثیر انہی چند ہستیوں میں سے تھا۔ لیکن ان چند ہستیوں میں بھی اسے خاص امتیاز حاصل تھا۔ اسے بنیادی امور اور بالخصوص تعلیمی معاملات میں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ وہ کسی معاملے میں رائے دینے سے پہلے اسکی اچھی چھان بین کر لیتا، اس کے اتار چڑھاؤ

کو سمجھتا اور اس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کو بھانپ لیتا اور پھر کسی قطعی نتیجے پر پہنچتا۔ کمال یہ تھا کہ اس کے قائم کئے ہوئے نتیجے ہمیشہ صحیح ہوتے۔ اس کے مشورے خالی باتیں ہی نہیں بلکہ عملی ہدایات بھی ہوتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ شاعرانہ تخیّل رکھنے والا انسان معاملات پر اتنے ٹھنڈے دل سے کیونکر غور کر سکتا ہے ؎

تعلیمی پروگرام کا جہاں تک تعلق ہے اس صوبے میں شاید ہی کوئی تعمیری کام ایسا ہوگا جس میں تاثیرؔ کا وسیع مطالعہ، اسکی گہری نظر اور عملی تجربہ شامل نہ ہو۔ آرٹ کونسل، بزم اقبال اور دارالترجمہ بڑی حد تک اس کی دور رس نگاہوں اور مفید مشوروں کا نتیجہ ہیں ؎

تاثیرؔ کی علمی اور تعلیمی سرگرمیاں فقط اس صوبے تک محدود نہ تھیں۔ اس جگہ اُس نے ایسے ذوق و شوق، خوش اسلوبی اور اہتمام سے کام کیا۔ کہ اس کی دلچسپیاں مرکزی حکومت کے وسیع دائرے تک پھیل گئیں اور وہاں کے تعلیمی منصوبوں اور کارگزاریوں میں اس کے عملی مشورے شامل ہونے لگے۔

تاثیرؔ سے مشورہ کرنے کے لئے کسی رسمی ملاقات کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اور اس کے لئے کوئی جگہ یا وقت بھی معین نہ تھا۔ وزیرِ تعلیم کا گھر ہو یا محکمۂ تعلیم کا دفتر، کھانے کا کمرہ ہو یا دوستوں کی محفل، وہ بڑی متانت اور سادگی کے ساتھ بڑے سے بڑے مسئلے پر گفتگو کر سکتا تھا۔ اس کی تفریحی باتوں میں بھی کوئی نہ کوئی کار آمد نکتہ ضرور ہوتا تھا۔ اسکی سادہ اور معمولی باتیں بھی میری بہت سی کاروباری مشکلات حل کر جاتی تھیں ؎

تاثیرؔ میں اور مجھ میں زندگی کا کاروباری رابطہ ہی نہیں تھا، تاثیرؔ میرا ہم جماعت اور دوست بھی تھا۔ ہمارے کاروباری رابطے نے دوستی کے رشتے کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اور ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو گئے۔ مجھے جب کبھی بھی اس کے یہاں جانے کا اتفاق ہوتا تو یوں محسوس ہوتا کہ تاثیرؔ کا گھر پیار کی فضا میں رچا ہوا ہے۔ تاثیرؔ کے بے ساختہ قہقہے، اس کی بیوی کے چہرے کی شگفتگی، بچّوں کی دلآویز مسکراہٹ دلوں کے سکون اور خلوص کا پتہ دیتی تھی۔ کتنا پیارا تھا تاثیرؔ!

تاثیر کی ادبی حیثیت اور عظمت مسلّم ہے۔ ہم سب اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ دوستوں کی اس عزّت اور مسرّت میں برابر کا شریک ہوں۔ لیکن تاثیر میرے لئے ادیب، شاعر اور نقّاد کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایک مخلص دوست اور ایک صحیح مشورہ دینے والا مشیر، تاثیر ایک زندہ، جیتا جاگتا تجربہ تھا۔ جس سے ملنا گویا زندگی کی عملی رہنمائی سے ہمکنار ہونا تھا۔

دنیا کے کام چلتے رہتے ہیں۔ تعلیمی معاملات کا بوجھ پہلے بھی میرے کندھوں پر تھا۔ اب بھی ہے۔ پہلے بھی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہے۔ لیکن اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں جب بھی کوئی الجھن پیش آتی ہے، تاثیر یاد آجاتا ہے۔

ایس ایم شریف
ڈائریکٹر محکمۂ تعلیم ——— پنجاب

پیش لفظ

★ تاؔثیر کے کلام کا جو منتخب مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں کم و بیش سبھی کچھ ہے۔ غزلیں بھی ہیں، قطعات بھی ہیں، نظمیں بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ صنفِ شعر کے بدل جانے سے شاعر کی ذہنی ساخت اور فکری پیمانے نہیں بدل جاتے۔ ہر صنف میں شاعر کے سوچنے کا اسلوب، اور ذہنی واردات کو بیان کرنے کا ڈھنگ ایک سا ہوتا ہے۔ فرق صرف صنف کی ہیئت کا ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے غزل اور نظم سے علیحدہ علیحدہ بحث کرنا بنیادی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اُردو کی کلاسیکی غزل مخصوص روایات کی حامل اور کچھ سمجھوتوں کی پابند ہے۔ لیکن غزل کا مزاج ایسا لچک دار ہے کہ وہ ردیف اور قافیئے کی پابندی کے باوجود ان مطالب اور معانی کو بھی بیان کر سکتی ہے جنہیں کلاسیکی روایت تغزل کے دائرے سے خارج سمجھتی ہے۔ حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کی غزلیں اِس دعوے کی شاہد ہیں۔ یہی حالت بیسویں صدی میں نظم کی ہے۔ جہاں غزل خالص تغزل کے سوا دوسرے مطالب کے بیان پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ وہاں نظم بھی بدرجہ احسن ہر قسم کی واردات کو بیان کر سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہو سکتا ہے کہ غزل میں کوئی شعر وارداتِ عاشقی سے متعلق نہ ہو اور وہ اچھی غزل ہو۔ اور نظم خالص تغزل کے اسلوب میں وارداتِ عاشقی کو بیان کرے۔ اور غزل میں اور اس میں صرف ہیئت کا فرق ہو۔ یہ اور بات ہے کہ شاعر قصداً مخصوص مطالب اور معانی بیان کرنے کے لئے نظم کو ذریعۂ اظہار بنائے۔ درآں حال وہی مطالب و معانی غزل میں بھی بیان ہو سکتے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غزل کو مخصوص ذہنی تجربات کے اظہار کے لئے استعمال کریں۔ حالانکہ وہی بات نظم میں بھی کہی جا سکتی ہے ؎

مَیں سمجھتا ہوں کہ تاثیر کا طبعی میلان نظم کی طرف تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ غزل کی ہیئت کی پابندیوں کی وجہ سے کچھ معنئ نازک کہ گفتنی ہوتے ہیں، بیان ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ کہ ایسا تو نظم میں بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ غزل کی ہیئت میں تصرف کرنا ناممکن ہے۔ کسی خاص غزل میں ایک آدھ رکن کے اضافے سے یا ایک آدھ رکن کے حذف کرنے سے غزل کی بنیادی ہیئت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے برخلاف نظم کی ہیئت میں تصرّف کیا جا سکتا ہے اور اس تصرّف سے نظم کی صورت کو مطالب و معانی سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ خیال کے طویل سلسلے کو ہیئتی تصرّف کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے۔ نظم کے ٹکڑوں کے گھٹانے بڑھانے سے خیال کے دوائر کا گھٹنا بڑھنا دکھایا جا سکتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہہ لیجیے کہ نظم میں (PUNCTUATION) یا علاماتِ اوقاف کو صحیح طور پر برتا جا سکتا ہے۔ بندوں کو علیحدہ کر کے ایک سلسلۂ خیال کا ختم ہونا اور دوسرے سلسلۂ خیال کا شروع ہونا دکھایا جا سکتا ہے۔ قوافی کے سلسلوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ ایک مصرعے یا ایک لفظ یا ایک جملے کی تکرار سے منشائے ذہنی کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل میں یہ صورت نہیں ہے۔ وہاں ہر شعر اکائی ہے۔ اور مان بھی لیجئے کہ غزل مسلسل ہے یا ایک ہی موڈ (تاثر) کا اظہار کرتی ہے۔ تو بھی ہر مصرعے کے وزن کا یکساں ہونا اور قافیے کا آخر میں آنا سلسلۂ خیال کی توقیف میں ضرور خلل انداز ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تاثیر کے ہاں جو باتیں گفتنی ہیں بیشتر نظم میں کہی گئی ہیں۔ اور غزل کو اُس نے بیشتر کلاسیکی روایت کے دائرے ہی میں رکھا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تاثیر کی غزل گوئی حقیقت میں مشقِ سخن ہے۔ غزل کہہ کے وہ اپنے زورِ بازو کو آزمانا چاہتا ہے۔ کہ اصل میں اس زور کو نظم میں صرف ہونا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تاثیر کی غزل یکسر روایتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ غزل میں بھی اُس نے بتدریج ان سمجھوتوں کو ترک کر دیا ہے جو بدلتے ہوئے معاشری اور تمدّنی حالات کے پیشِ نظر بالکل غیر فطری اور مصنوعی ہو گئے تھے۔ جن سے

تیس سال تک کی عمر میں تاثیر نے جو غزلیں کہی ہیں۔ ان کا انداز یہ ہے :- ؎

یہ بھی رہے خیال ستانے کے ساتھ ساتھ
ہم بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ
رُک رُک کے ہو رہے ہیں ادا حرفِ معذرت
کچھ کچھ غرور بھی ہے بہانے کے ساتھ ساتھ

کس نے کب کس پہ کیا ظلم یہ قصّہ کیا ہے
تم اگر بھول گئے ہو تو مجھے یاد نہیں
یہ گلستاں ہے کہ زنداں ہے کہ صحرا کیا ہے
کوئی بجلی نہیں گل چیں نہیں صیّاد نہیں
اِک نظر ایک چمکتا ہوُا آنسو سرِ بزم
اور روداد محبّت مجھے کچھ یاد نہیں

آخری تین اشعار کی فکری نیرنگی اور گوناگونی پر غور کیجیئے گا۔ پہلا شعر داغ کی معاملہ بندی اور وقوع گوئی کی یاد دِلاتا ہے۔ دوسرے کا مقام نِسبتاً بلند ہے۔ تیسرے شعر پر اقبال کے اس شعر کا نمایاں اثر معلوم ہوتا ہے :-

یک نگاہ یک خندۂ دز دیدہ یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبّت نیز سو گندِ دِگر

اسی زمانے کی مشہور غزل ہے۔ جس کا مطلع ہے ، ؎ میری دفائیں یاد کروگے
روؤ گے فریاد کروگے

اس میں دو تین شعر وہی داغ کی معاملہ بندی کے سے ہیں۔ جس کا تاثیر پر بڑا گہرا اثر تھا۔ مثلاً :- ؎ آکر بھی ناشاد کیا تھا جا کر بھی ناشاد کروگے

لیکن اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے ؎

محفل کی محفل ہے غمگیں کس کس کا دل شاد کروگے

میں نے ابھی کہا ہے کہ تاثیر پر داغ کی وقوع گوئی اور معاملہ بندی کا بہت اثر تھا۔ آخری برسوں میں جو اُس نے غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں بھی یہ رنگ برابر جھلکتا ہے۔ داغ کی غزل کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ اُن میں ڈرامائی عنصر بہت ہے۔ اور کبھی ایسا مزہ دے جاتا ہے کہ باید و شاید۔ اور وہ داغ کا یہ شعر بہت مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے ؎

اپنی تصویر پہ نازاں ہو، تمہارا کیا ہے؟
آنکھ نرگس کی، دہن غنچہ کا حیرت میری!

انہوں نے بڑی عقیدت سے داغ کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں اور بعض غزلوں میں کچھ اشعار ایسے ہیں کہ داغ کے اشعار سے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ مثلاً عمر کے آخری چند سالوں کی غزل ہے

غیر کے خط میں مجھے ان کے پیام آتے ہیں
کوئی مانے کہ نہ مانے میرے نام آتے ہیں
داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں
واعظِ شہر کی محفل ہے کہ ہے بزمِ نشاط
حوضِ کوثر سے چھلکتے ہوئے جام آتے ہیں

اِس غزل میں داغ نے ایک نہایت اچھا شعر کہا تھا ؎

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

تاثیر نے اس سے ہٹ کر نہایت تیکھا شعر کہا ہے ؎

یہ رہِ شوق رہِ عشق ہے اے اہلِ ہوس
منزلیں آتی ہیں اس میں نہ مقام آتے ہیں

وقوع گوئی یا معاملہ بندی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ان وارداتِ عاشقی کا بیان ہے۔ جو عام طور پر پیش آتی رہتی ہیں۔ جو واقع ہوتی ہیں۔ اب داغ کی وقوع گوئی ایک خاص تمدنی مزاج اور معاشرت کی ترجمان ہے۔ داغ کی محبوبہ مسلّم ہے۔ کہ ایک طوائف ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ داغ اور حجاب کے مراسم کیا تھے۔ جب داغ حیدر آباد میں تھے۔ تو انہوں نے وہاں بھی ایک طوائف ملازم رکھی تھی۔ حجاب بھی آخر آکر داغ کے پاس رہنے لگی تھیں۔ دہلی اور رام پور میں بھی اوائل عمر ہی میں داغ کو ایسے موقعے اکثر ملے تھے کہ وہ طوائفوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ سکے۔ داغ کے کسی سوانح نگار نے حجاب کے قصّے کے سوا داغ کے کسی اور معاشقے کا ذکر نہیں کیا۔ اِس تمہید کا مقصود یہ ہے کہ داغ کے ہاں معاملہ بندی اور وقوع گوئی کا جو اسلوب ہے اس کا تعلق طوائف ہی سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے کی طوائف اکثر شائستہ، نستعلیق اور مزاج دان ہوتی تھی۔ لیکن ہوتی تو آخر طوائف ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ داغ کی معاملہ بندی میں چھیڑ چھاڑ، طعن و تشنیع اور محبوبہ کو جلی کٹی سُنانے کے مضامین عام ہیں۔ تاثیر نے داغ کی معاملہ بندی پر نظر ڈالی تو اسے حقیقت کے بہت قریب پایا۔ اس لئے انہیں داغ کا یہ اسلوب بہت پسند آیا کہ داغ کی بات بلند مقام سے ہو یا نہ ہو لیکن دل پذیر، شوخ اور کھری ضرور ہے۔ ظاہر ہے کہ تاثیر نے وہ تمدنی ماحول نہیں پایا۔ جو داغ نے پایا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں طوائفوں کے ہاں آنا جانا

معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔ علاوہ ازیں اب وہ شائستہ اور نستعلیق طوائف بھی نہیں رہی تھی، جو وقوع گوئی کا موضوع بن سکتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نظربازی کے راستے مسدود ہو گئے تھے اور وقوع گوئی کے موضوع ناپید ہو گئے تھے۔ معاشرت بدل گئی تھی۔ تمدنی مزاج بدل گیا تھا۔ اخلاقی اقدار بدل گئی تھیں۔ لیکن نظریں نظروں سے پھر بھی ملتی تھیں، وقوع گوئی کے موقعے پھر بھی پیدا ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ موقعے داغ کے موقعوں سے بالکل مختلف تھے۔ تاثیر نے ان تمام موقعوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کو گہری نظر سے دیکھا ہے۔ داغ کے رنگ میں وقوع گوئی کی ہے۔ لیکن ترجمان وہ اپنے ماحول اور اپنی معاشرت ہی کا ہے۔ داغ کے شاگردوں میں اور تاثیر میں یہی نمایاں فرق ہے۔ داغ کے بیشتر شاگرد داغ ہی کے مضامین میں تصرّف کر کے کچھ شعر کا تیور بدل کے سمجھتے تھے کہ یہی وقوع گوئی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بساط طے ہو چکی ہے۔ جس قسم کی معاملہ بندی وہ لکھتے ہیں وہ مشاہدے میں نہیں آتی۔ اس کے برخلاف تاثیر کی وقوع گوئی عین اس کی زندگی کی اقدار اور اس کے ماحول کی ترجمان ہے۔ میری نظر میں یہ اُردو شعر گوئی میں بہت بڑا اضافہ ہے۔ کہ معاملہ بندی جو عملاً مٹتی چلی جا رہی تھی، تاثیر نے اس کا احیاء کیا۔ تاثیر کی یہ غزل دیکھئے جس میں معاملہ بندی کا موضوع طوائف نہیں بلکہ بیسویں صدی کی شائستہ اور نستعلیق عورت ہے۔ اس کے ساتھ بات سنبھال کر کرنا پڑتی ہے کہ سمجھ دار بھی ہے اور طرّار بھی۔ یہاں نظربازی کا اسلوب بالکل مختلف ہے۔ بات کرنے کا ڈھب بالکل جُدا ہے۔ ہرچند دائرہ وہی معاملہ بندی اور وقوع گوئی کا ہے

طے ہو گیا ہم ترکِ ملاقات کریں گے ۔۔۔ اب تک جو نہ ہو سکتی تھی وہ بات کریں گے
غم کھا کے لہو پی کے باندازِ تغزل ۔۔۔ جس طرح بھی ہو گی گزر اوقات کریں گے
یوں وہ سرِ محفل، سرِ راہے جو ملے بھی ۔۔۔ منہ پھیر کے اوروں سے اشارات کریں گے
آداب سے مجبور اگر ہو بھی گئے ہم ۔۔۔ ہنستے ہوئے موسم کی کوئی بات کریں گے

جس طرح بھی ہوگی گذر اوقات کرینگے طے ہو گیا ہم ترکِ ملاقات کرینگے

میں نے کہا تھا کہ اگرچہ تاثیرؔ کی غزل سرائی اصلاً مشقِ سخن ہے کہ نظم نگاری میں کام آئے لیکن یکسر روایتی نہیں ہے۔ اُردو شاعری کی ایک مسلّم روایت ہے کہ چاہنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اس کی محبوبہ اسے ضرور چاہے۔ اُردو کلاسیکی شاعری کے بہت سے شکوے اور گِلے، ہجر کی بہت سی طویل لیکن بے مصرف راتیں، فریاد و فغاں اور آہ و زاری کے بہت سے مرحلے اسی غیر مہذب دھاندلی سے پیدا ہوئے ہیں۔ غالباً کلاسیکی شعراء میں غالبؔ پہلا شاعر ہے جس نے اس روایت کے خلاف احتجاج کیا۔ اور جو بہت سی روح فرسا منزلوں سے گذر کر تہذیب ذہنی کے اس مقام تک پہنچا کہ ؎

نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے
لطافتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیئے
نہ ہو نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روشِ و مستیٔ ادا کہیئے

حفیظؔ نے بھی اس مقام کو چھو لیا تھا۔ اگرچہ اس کے ہاں وہ توازن ذہنی نہیں جو غالبؔ کے ہاں ملتا ہے۔ اس کے اشعار میں کچھ زہر خند کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

حُسن پابندِ رضا ہو مجھے منظور نہیں
مَیں کہوں تم مجھے چاہو مجھے منظور نہیں

بیسویں صدی میں ظاہر ہے یہ دھاندلی دیر تک نہیں چل سکتی تھی۔ آپ کو کسی سے محبت کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اسے بھی آپ کو یا کسی اور کو چاہنے کا ویسا ہی حق حاصل ہے۔ اس حق کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا اور بات ہے اور مجبور ہو کر رہ جانا اور بات ہے۔ رقابت کے تمام مضمون مجبوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے تاثیرؔ کی تمام غزلوں میں رقابت کا مضمون نظر نہیں پڑا۔ یا اگر ہوگا تو ابتدائی

غزلوں میں یہ طریقِ روایت بندھ گیا ہوگا۔ جوں جوں تاثیر کا ذہنی نشو و نما تہذیب کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ اسی اعتبار سے وہ محبوبہ کے اس حق کو بہ خندہ پیشانی قبول کرتے چلے گئے۔ کہ وہ چاہے تو رکسی اور سے محبت کر سکتی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ تاثیر اس منزل سے اور آگے بڑھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس معاشرت کی وہ ترجمانی کرتے تھے اس دائرے میں ایسی عورتیں بھی پائی جاتی تھیں جو یہ تو چاہتی تھیں کہ لوگ انہیں چاہیں اور ان کی روشِ دلبری کی داد دیں لیکن اُن سے شگفتہ کلامی اور شگفتہ جبینی کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھیں۔ یہ تو شاید نسوانی فطرت ہے کہ ہر عورت چاہتی ہے کہ وہ چاہی جائے۔ لیکن جدید معاشرہ ایسی عورت کا سراغ بھی دیتا ہے جو پڑھی لکھی ہے۔ شائستہ ہے خوش کلام ہے، شگفتہ رو ہے اور چاہتی ہے کہ بہت سے لوگ اس کے حسن یا جنس کے دائرۂ طلسمی میں دائماً اسیر رہیں۔ ایسی عورت صرف مرد کو مسخر کرنا چاہتی ہے۔ مسخر ہونا نہیں چاہتی۔ اس کی بے تکلفی تغافل سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور اس کی خوش کلامی دشنام طرازی سے زیادہ آشوب افگن۔ تاثیر ایسی عورت سے ملے ہیں۔ اسے اچھی طرح پرکھا ہے۔ اسے چاہا ہے۔ یہ بھی خوب دیکھ لیا ہے کہ یہ صرف انہیں اپنے دامِ محبت میں گرفتار کرنا چاہتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے باوجود تاثیر نے نہ صرف ایسی عورت کا حق دلبری تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اسے معاف بھی کیا ہے۔ یہ تہذیب ذہنی کی آخری منزل ہے۔ معاف کرنے کی جو صورت تاثیر نے اختیار کی ہے۔ وہ بے نظیر ہے۔ اُنہوں نے اپنے آپ سے یہ کہا ہے کہ دلبری کی یہ تمام ادائیں، عشوہ گری کے یہ تمام اسلوب، یہ خوش کلامی، یہ شگفتہ جبینی اس عورت کے فطری اوصاف ہیں۔ اس کی نیت فریب دینے کی نہیں ہے۔ وہ اس لئے ہنستی ہے کہ زندگی اس کے وجود معنوی میں فوارے کی مانند اُبلی پڑتی ہے۔ اس کی شگفتہ کلامی فریب کاری پر مبنی نہیں بلکہ لازمۂ تہذیب ہے۔ معلوم نہیں تاثیر کا ذہن کیسے کیسے دوزخوں میں سے گذرا ہوگا، تب اسے یہ مقام حاصل ہوا۔ یہ غزل دیکھئے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن کو بھی

میں ڈالا گیا ہے لیکن وہ تپ کر کندن ہو گیا ہے ؎

وہ ملے تو بے تکلف نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریق آشنائی نہ رسوم جام و بادہ

تیری نیم کش نگاہیں، تیرا زیرِ لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی، یونہی اک فریب سادہ

یہ دلیل خوشدلی ہے میرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
میری آرزو سے کمتر میری تاب سے زیادہ

تاثیر کی ایک غزل ہے جو میرے علم کے مطابق تقسیم کے بعد کہی گئی ہے۔ یہ غزل انہیں ایک مشاعرے میں پڑھنا تھی۔ مجھے بھی اس مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔ اتفاق کی بات ہے وہ میرے ہاں آئے کہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں نہ جا سکا لیکن ان سے غزل سن لی۔ ان کے بیان کے مطابق اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے دلبری اور عشوہ گری اور فتنہ کاری کے جو معیار مختلف قوموں کے میل جول سے پیدا ہوئے تھے وہ تقسیم کے بعد یکبارگی پست ہو گئے اور پھر پست سے پست تر ہوتے چلے گئے۔ دوستوں کی بہت سی جگمگاتی ہوئی محفلیں سونی ہو گئیں۔ بہت سے اشغال و اذکار کی بساط بالکل الٹ دی گئی۔ بہت سے معاشقوں کے رشتے بہ جبر و قہر توڑ دیئے گئے۔ نہ وہ آستان رہے نہ وہ سنگِ در۔ البتہ کچھ آشفتہ حال سر پھوڑنے کو رہ گئے۔ یہ بات مزید تشریح سے گریز کرتی ہے۔ غزل پڑھ لیجئے :-

لطفِ وفا نہیں کہ وہ بیداد گر، نہیں

خاموش ہوں کہ میری فغاں بے اثر نہیں
ان کے بغیر تلخیٔ کام و دہن حرام
دردِ جگر ہے لذتِ دردِ جگر نہیں
تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں
ہر ہر روش معاملۂ حسن و عاشقی
ہر ہر قدم فروغِ جمالِ نظر نہیں
بے باک چال چال سے بے باک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں
سجدوں سے نامراد ہے جلووں سے ناامید
وہ راہگذر کہ اب جو تیری راہ گذر نہیں

یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے شعر میں پہلا مصرع تاثیر نے پہلے یوں لکھا تھا ؎ لاہور سے وہ کیا گئے سب کچھ چلا گیا

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تاثیر کا میلانِ طبعی نظم کی طرف تھا. مختلف علوم و فنون پر جو انہیں احاطہ تھا، مختلف زبانوں پر جو انہیں عبور تھا۔ اظہارِ معنی بلند پر جو انہیں قدرت تھی وہ بیشتر بے شک نظم ہی میں ظاہر ہوتی تھی. لیکن غزلوں میں بھی بعض اشعار ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاثیر کتنے گہرے پانی میں تھے.

انسان (ظاہر ہے کہ شاعر بھی انسان ہے) شروع سے، بلوغت سے بہت پہلے سے ذہن میں حسن و جمال اور دلبری و دل پذیری کی ایک مثالی تصویر قائم رکھتا ہے۔ یہ ذہنی تصویر مختلف خطوط

سے مرتب ہوتی ہے۔ لیکن جب ایک بار ذہن میں قائم ہو چکے تو جانِ تمنا بن جاتی ہے۔ اِسی مثالی تصویر کی جستجو میں شاعر اور فنکار عمر بھر سرگرداں رہتا ہے۔ جہاں اس تصویر کا کوئی نقش، کوئی خط، کوئی جھلک نظر پڑتی ہے وہیں فریفتگی اور شیفتگی کا سا عالم طاری ہوتا ہے۔ غالباً یہ تصویر اپنی پوری شانِ جمال میں تو کبھی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ اس کے جزوی مظاہر البتہ نظر افروز ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی صورتوں میں عشق بیک نظر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ بعض صورتوں میں یہ جذبہ ایک بار نہیں کئی بار ابھرتا اور مٹتا ہے۔ مثالی تصویر سے مشابہ جو صورت نظر پڑی تھی اس کی طرف تو میلانِ طبع ہوتا ہی ہے اور آگ سلگتی ہے۔ لیکن اگر اس کے بعد کوئی اور صورت مثالی تصویر سے قریب تر نظر پڑے تو تمنا کا رُخ پھر جاتا ہے۔ اگرچہ ہر چند کہ چنگاری جوں کی توں سلگتی رہتی ہے۔ یعنی اصلی تصویر سے لگاؤ ویسے کا ویسا ہی قائم رہتا ہے۔ اس مضمون کو میرؔ نے نہایت پیارے انداز میں بیان کیا ہے ؎

جیتے جی کوچۂ دل دار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے میرے سایا نہ گیا

دل سے شوق رُخ نکو نہ گیا　　تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اِس مقام کو تاثیرؔ نے بھی بیان کیا ہے۔ اور بڑی وقتِ نظر اور اصابتِ رائے کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

محبت، نامجوری، بے قراری　　محبت، قہقہے، فریاد و زاری
نہ ہونا ہو تو ترکش بے جراحت　　جو ہونا ہو تو پہلا وار کاری
خسرو نے ہاتھ پر تلوار روکی　　جنوں نے گھونپ دی دل میں کٹاری

میں نے غزل کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ تاثیرؔ نے غزل گوئی مشقِ سخن کے طور پر کی تھی۔ اپنا

زورِ بازو آزمایا تھا اور حقیقت میں یہ زور نظم میں صرف ہوتا تھا۔ اب وہ مرحلہ آگیا ہے کہ اس اجمال کی تفصیل بیان کی جائے۔ زندگی کے آخری سالوں میں مَیں نے تاثیر کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اس وقت اپنی نشو و نمائے ذہنی کے عروج پر تھے۔ لیکن دراصل میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کا ذہن دراصل مجموعہ اضداد تھا۔ ایک طرف وہ قرآن مجید اور تفسیر و فقہ کی باریکیوں پر نظر رکھتے تھے تو دوسری طرف برصغیر ہند و پاکستان میں فنونِ لطیفہ کے بہت بڑے نقاد تھے۔ جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے وہ عربی جانتے تھے، اُردو بولتے اور لکھتے تھے۔ فارسی سے آگاہ تھے۔ انگریزی ادبیات کے ماہر تھے۔ اور پنجابی زبان سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے مطالعے کی یہ کیفیت تھی کہ نفسیات، عمرانیات اور اقتصادیات سے لے کر انتقاد اور خالص ادبیات تک بہت سے علوم و فنون اُنہیں مستحضر تھے۔ سائنس کے جدید ترین انکشافات سے بھی باخبر تھے۔ اور جمال کا ایسا صحیح احساس اور شعر کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے کہ باید و شاید۔ ان کی بذلہ سنجی اور شگفتہ کلامی کا یہ عالم تھا۔ کہ بہت سی باتیں جو شعر میں کہی جا سکتی تھیں لطیفہ ہو کر چٹکیوں میں اُڑ گئیں۔ ظاہر ہے کہ اِس قسم کا شخص، اس طرح کا فنکار جب گفتنی باتوں کے اظہار پر آمادہ ہوتا ہوگا۔ تو اس کی دسترس میں علائم و رموز، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کے خزانے ہوتے ہوں گے جن کو وہ حسبِ منشا استعمال کرتا ہوگا۔ بات دقیق اور پیچ دار ہو تو اس کو ادا کرنے کے لئے کسی اور علم یا فن کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ استعارے اور تشبیہہ کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔ تاثیر کی تو طبیعت پیچ دار تھی۔ بات پیچدار تھی۔ سوچنے کا اسلوب پیچدار تھا۔ اور مختلف علوم و فنون پر جو اسے قدرت حاصل تھی اظہارِ مطالب میں وہ انہیں اس طرح استعمال کرتا تھا کہ اس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ وارداتِ دل بیان ہو رہی ہیں اور وسیلہ موسیقی کی اصطلاحات ہیں۔ نرتکی کوائف کا ذکر ہے اور علامات و رموز نفسیات کی ہیں۔ نفسیاتی حقیقتوں کا بیان ہے اور ابلاغ مصوّری کی مصطلحات کے ذریعے ہو رہا ہے۔ اس طریق کار نے

اس اسلوبِ اظہار نے تاثیر کی منظومات میں بہت پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ اسلوب کی پیچیدگیاں نہیں ہیں۔ یہ مطالب و معانی کی بلندی اور پیچیدگی ہے جو طبعاً پیچ دار اسلوب اظہار کا تقاضہ کرتی ہے۔

تاثیر، جیسا کہ ظاہر ہے۔ بیسویں صدی کا فنکار تھا۔ اور بیسویں صدی کے فنکار اور شاعر کو کچھ سہولتیں بھی میسّر تھیں اور کچھ دشواریاں بھی درپیش تھیں۔ سہولتیں تو یہ تھیں کہ سائنسی انکشافات اور نفسیاتی تجربات نے شاعر کے لئے یہ ممکن بنا دیا تھا کہ وہ اپنی ذات کا نسبتاً زیادہ گہرا شعور حاصل کرے۔ فرائیڈ اور ژنگ کے نظریات، طبیعات کے انکشافات اور ہئیت کی حیرت انگیز دریافتوں نے سوچنے کی نئی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ اپنے متعلق، اپنے اور فطرت کے تعلق کے متعلق، فطرت کے رموز کے متعلق انسان کا علم (ظاہر ہے کہ شاعر بھی انسان ہے) زیادہ گہرا اور دور رس ہوگیا تھا ——— ، دشواریاں یہ تھیں کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے گویا دنیا ایک تپتے ہوئے دوزخ میں ڈال دی گئی تھی۔ جس میں مختلف اقتصادی، اخلاقی اور عمرانی اقدار پگھل گئی تھیں۔ پہلی جنگِ عظیم سے لے کر دوسری جنگِ عظیم تک اِنسان پر ایک تذبذب کا سا عالم طاری رہا۔ پُرانی اقدار ملیامیٹ ہوگئیں لیکن نئی اقدار متحجّر نہ ہو سکیں۔ دوسری جنگِ عظیم نے پھر انسان کے تمدنی اور اخلاقی مزاج کو ایک کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔ یہ کڑھاؤ ابھی تک کھول رہا ہے۔ نئی اقدار کی دھات ابھی کندن ہو کر باہر نہیں نکلی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ بیسویں صدی کا شاعر اور فن کار بہت سی دشواریوں سے دوچار ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرتی رجحانات، تغیّر پذیر اخلاقی اقدار، پگھلتا ہُوا تمدنی مزاج جہاں سوچنے کی نئی راہیں کھولتا ہے وہاں تذبذب اور ذہنی انتشار بھی پیدا کرتا ہے۔ تاثیر کی منظومات اِس بدلتے ہوئے ماحول، ان تغیّر پذیر اقدار، اس پگھلتے ہوئے مزاج کی آئینہ دار ہیں۔ ان تمام انکشافات سے بہرہ یاب ہیں جو بیسویں صدی سے مخصوص ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک، اپنے دیس اور اپنے تمدن کے مخصوص حالات کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ ان منظومات میں ایک سائنسی متوازن اور غیر متضاد نظامِ فکر

کی جستجو بے سود ہے۔ تاثیر کی نظمیں بدلتے ہوئے ماحول کی اور پگھلتے ہوئے اقدار کی تصویریں ہیں۔ اور ان کی بنیاد اسی ذہنی نا استواری پر ہے۔ جو بیسویں صدی سے مخصوص ہے۔ میں اس سلسلے میں دو تین نظموں کا تجزیہ کروں گا۔ مقصد یہ ہوگا کہ ایک تو یہ واضح کیا جائے کہ تاثیر کس قدر مختلف النوع علایم و رموز استعمال کرتا ہے اور معنیٔ دقیق کو کس خوبی سے ادا کر سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے وطن اپنے تمدن کے تغیرات کے ساتھ ساتھ تمام بیرونی اور خارجی حالات کا کس قدر دقت نظر سے مطالعہ کرتا ہے صنعت گری اور فن کاری کے جو ثبوت اس تجزیے کے سلسلے میں مہیا ہوں گے، ظاہر ہے کہ ان کا تذکرہ بھی کیا جائے گا۔ لیکن مطالب سے ہٹ کر نہیں۔ مراد یہ ہے کہ میں صورت کو معانی سے علیحدہ کر کے نہیں پرکھوں گا۔ کہ نفسیاتی اعتبار سے بے ہودہ بات ہے۔ اسلوب کلام اور انداز نگارش اصلاً معانی کے تابع ہوتا ہے۔ اور معانی سے اس طرح ہم آہنگ ہوتا ہے کہ دونوں کو جدا کرنا صرف نظریاتی طور پر ممکن ہے۔ اقبال کہتا ہے سے

اختلاطِ لفظ و معنی ارتباطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

ان میں سے ایک نظم "دیوا داسی" ہے۔ پہلے یہ "کلیتاً" نقل کی جاتی ہے۔ پھر اس کا تجزیہ کیا جائے گا

(۱) بال سنوارے، مانگ نکالے
دوہرا تہرا آنچل ڈالے،
ناک میں بندی، کان میں بالے
جگ مگ جگ مگ کرنے والے

(۲) ماتھے پر چندن کا ٹیکا

آنکھ میں انجن پھیکا پھیکا
مدھ ماتی متوالی آنکھیں
جوبن کی رکھوالی آنکھیں

(۳) آنکھ جھکائے لٹ چھٹکائے
جانے کس کی لگن لگائے؟
جمن کنارے پریم دوارے
برہ اداسی۔ درشن پیاسی،

دیوا داسی تن من ہارے
تنہا اپنے آپ کھڑی ہے
بُت بن کر چُپ چاپ کھڑی ہے

اِس نظم کے دو پس منظر ہیں۔ ایک تاریخی دوسرے نفسیاتی۔ دونوں سے تاثیر کما حقہ آگاہ ہے اور واضح رہے کہ یہ نظم ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی ہے۔ تاریخی پس منظر کی تفصیل یہ ہے کہ دراصل ہندو مت اور ہندو فلسفہ اپنے تمام مظاہر اور مناظر میں نفسِ انسانی کی تذلیل اور مسکنت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ موسیقی دیوتاؤں کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت و نیاز اور اظہارِ مسکنت ہے۔ کلاسیکی وِدّیا کے ماہرات کے راگوں میں بہ تخصیص 'بھوپالی' کا یہ خیال گاتے ہیں ؎

مہادیو، ہے ؎

مہادیو جو حقیقت میں شوجی مہاراج کا دوسرا لقب ہے کہ وہ نٹ راج بھی ہیں۔ موسیقی، رقص اور زندگی کی بدلتی ہوئی گوناگوں کیفیات کے دیوتا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت میں بالعموم تمام راگ اور راگنیاں عقیدت اور مسکنت کا اظہار کرتی ہیں۔ اور انسان کی خودی کی نفی کرتی ہیں۔

جب مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب مختلف سمتوں سے شمالی ہندوستان کی طرف بڑھا تو ہندو مت کا اصلی مشرب اور مسلک طبعاً سمٹ کر جنوبی ہندوستان کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں مسلمانوں نے دکن کے اضلاع پر بھی حملے کئے ہیں لیکن وہاں کم و بیش وہی تمدّن وہی مسلک و مشرب قائم رہا۔ جو ہندو تمدّن سے مخصوص تھا۔ یہاں صورت یہ تھی کہ جب کوئی مُراد بر آتی تھی یا کوئی آرزو پوری ہوتی تھی تو عقیدت مند دیوتا کے استھان پر لڑکیاں بھی چڑھاوے کے طور پر پیش کر دیا کرتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں اسلامی تمدّن کے اخلاط اور میل جول کی وجہ سے یہ مسلک بہت حد تک اتنا شدید نہ رہا لیکن جنوبی ہندوستان میں جہاں ہندو مت اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر تھا۔ اس مسلک کی شدید صورت ہمیشہ نظر آتی رہی۔ یہاں جو لڑکیاں نذرِ عقیدت کے طور پر مندروں میں پہنچا دی جاتی تھیں ان کو دیوا داسی کہتے تھے۔ دیو کے معنی دیوتا یا خدا یا مولا کے ہیں۔ داس غلام کو کہتے ہیں۔ داسی اس کی تانیث ہے۔ تو دیوا داسی دیوتاؤں کی کنیز ہے۔ اصلاً دیوا داسی کا منصب یہ تھا کہ دیوتاؤں کے بتوں کو پاک و صاف رکھے۔ وہاں کے پاکیزہ نفس پجاریوں اور پروہتوں کی خدمت کرے۔ لیکن جوں جوں ہندو مت تغیّر پذیر اور زوال آشنا ہوتا چلا گیا۔ دیوا داسی اپنے منصبِ جلیل سے گرتی چلی گئی۔ دیوتا جو پاکیزگی اور تقدس اور وقار کی علامت تھے۔ پجاریوں کی تجارت کا ذریعہ بن کر رہ گئے۔ چڑھاوے اور نذرانے جو محبت اور عقیدت کی علامت تھے آمدنی کا ذریعہ بن گئے۔ جوں جوں مندر تقدس اور احترام کے مسکن کی بجائے نفس پرستی کے معاون بنتے چلے گئے اور پجاری اور پروہت اپنی ناپاکیزہ ہوسوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ تو دیوا داسی کا مقام بھی پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ وہ آیا کہ دیو داسی نہ صرف پروہتوں کی ہوس کاری کا شکار ہوتی تھی بلکہ مندر میں تمام آنے والے مسافر بسہولت طے شدہ نرخ کے مطابق اس کا جسم اور اس کے جسم کی عشوہ گری خرید سکتے تھے۔ جب تک دیو داسی اس مقام تک نہیں آئی ہے اُس وقت تک

ع

دیو داسی کے لقب کے ساتھ فنکاری کے کچھ تصوّرات بھی وابستہ تھے۔ چنانچہ روایتیں، افسانے اور داستانیں ایسی دیو داسیوں کا ذکر کرتی ہیں جو ناچ اور کلاسیکل سنگیت کی ماہر تھیں۔ اور جنہیں سنگیت ودّیا سے بڑا پریم تھا۔ یہ دیو داسیاں پستی کے آخری درجوں تک پہنچنے سے پہلے گویا دیوتاؤں کو اپنے ناچ اور گانے سے لبھاتی اور رجھاتی تھیں۔ کیونکہ جیسے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت دیوتاؤں کی خدمت میں ہدیۂ نیاز و عقیدت ہے۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ رگ وید حقیقت میں راگ وید ہو اور کتھا حقیقت میں وہی گتھا ہو جو زرتشت کے صحائف کے ایک جزو کا نام ہے۔ اور قیاس یہ بھی چاہتا ہے کہ گت اور گیت کا تعلق اسی کتھا اور گتھا سے ہو۔ قدیم زمانے میں ان دیو داسیوں کو کیا مقام حاصل تھا۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ روایت اور افسانوں کے مطابق ایک زنِ رقاصۂ عشوہ فروش نے گوتم بدھ کے صبر اور استقامت کا امتحان لینا چاہا۔ یہ رقاصہ بظنِ غالب کوئی دیو داسی ہے۔ اور غالباً یہی واقعہ ہے جس کی طرف اقبال نے زبورِ عجم میں "طاسینِ گوتم" کے عنوان سے اشارہ کیا ہے۔ جنسی زندگی کا مسئلہ ہندومت میں بہت پیچ دار ہے۔ اور اس کے بہت سے تار و پود بہت سے مذہبی رسوم کے دھاگوں سے الجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جنوبی ہندوستان میں مندروں میں دیوتاؤں کی جو جنسی زندگی کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ وہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ دیو داسی دیوتاؤں کی خدمت میں ایک عقیدت تھی۔ جس کا ہدیہ زیست دیوتاؤں کو لبھانا اور رجھانا تھا۔ لیکن بہ مرورِ زماں ہندومت کی زوال پذیری کے ساتھ ساتھ دیو داسی کا مقام بھی پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مندر کے پروہتوں اور مندر کے عارضی مہمانوں کی ہوس رانی اور نفس پرستی کا آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

یہ تو اس نظم کا تاریخی پس منظر ہے۔ اس کا نفسیاتی پس منظر اور بھی زیادہ الجھا ہوا اور پراسرار ہے انسان نے قدیم الایام سے عورت کی عریانی اور اس کی بے نقابی میں امتیاز کیا ہے۔ عریانی ایک فعل جسمانی ہے خالص اور بعض اوقات بجبر و قہر واقع ہوتا ہے۔ عورت کی دریافت اس کے وجود باطنی کا مکشوف ہوتا ہے اس

دیا جاتا ہے۔ یہ بے تابی، اضطراب اور الجھن صرف دیوداسی سے مخصوص نہیں۔ ہر زمانے میں ہر وہ عورت جس کے جسم کا سودا چکا دیا گیا ہے۔ اسی قسم کی الجھن اور اضطراب کا شکار رہتی ہے۔ یوں تاثیر کی نظم دیوداسی اگرچہ اصلاً اور اساساً مندر کی ان کنیزوں کی تصویر ہے جن کی روحوں کو پامال کر دیا گیا ہے۔ لیکن ضمناً یا بہ تقریب استقرار ان تمام عورتوں کی زندگی کی ترجمان ہے جن کے بدن پر تصرّف پانے والے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے ان عورتوں کی روحوں کو بھی مسخر کر لیا ہے۔

دیوداسی کے عنوان میں ایک بات اور بھی توجہ کے قابل ہے۔ بے شک سنسکرت میں دیوداسی کے معنی دیوتا کی کنیز ہے لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں فارسی اور اردو میں دیو شیطان کو کہتے ہیں۔ MAX MULLER کی تحقیقات کے مطابق جب زرتشت نے قدیم دیوی دیوتاؤں کے خلاف بغاوت کی تو اس نے کہا کہ آریائی دیوتا یعنی خدا ارباب میرے لئے درحقیقت شیطان ہے۔ میں ان سے تبرّا کرتا ہوں ——— ؎

میرے ذہن میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہے کہ تاثیر کے دماغ میں دیوداسی کے متعلق جو تصوّرات تھے ان کے پیچاک میں یہ بات بھی الجھی ہوئی تھی۔ گویا بمرورِ زماں دیوداسی اگرچہ دیوتاؤں کی کنیز نہ رہی تھی۔ شیطان کی باندی اور شیطنیت کا آلۂ کار ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے نسوانیت کو برقرار رکھا تھا۔ اور اس کی روح میں ایک اجالا سا ضرور لرزتا رہتا تھا۔ ان امور کی صراحت کے بعد اب مختلف بندوں پر ذرا نظر ڈال لینی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلے بند میں دوسرا مصرع ؎ دوہرا تہرا آنچل ڈالے ذہن کو فوراً اس حقیقت کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے کہ دیوداسی ہر چند روز اپنے بدن کا سودا چکاتی ہے۔ جسماً عریاں کی جاتی ہے۔ لیکن اس کی روح اور اس کے وجودِ باطنی پر گہرے پردے پڑے رہتے ہیں۔ یہ دوہرا تہرا آنچل وہ خطِ مدافعت ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ——— ،

؎ ناک میں بندی کان میں بالے جگ مگ جگ مگ کرنے والے

حقیقت میں دیوداسی کی روح کی تابناکی کی علامتیں ہیں۔ یہ زیور نہیں امید کے وہ ستارے ہیں جو اس کے

وجودِ باطنی کے اندر پوشیدہ ہیں۔ دوسرے بند میں

؎ مدھ ماتی متوالی آنکھیں
جوبن کی رکھوالی آنکھیں

نہایت پراسرار اور بلیغ شعر ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آنکھیں روح کا آئینہ ہیں۔ لطیف ترین جذبات کے اظہار آنکھوں ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ دقیق ترین باتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہو تو پورا چہرہ نکھرا نکھرا اور ذہین معلوم ہوتا ہے۔ سپردگی کی تمام جسمانی اور ذہنی کیفیات بیشتر آنکھوں ہی میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سپردگی روحانی ہو یا جنسی اپنے بلیغ ترین اظہار کے لئے آنکھوں اور نظروں ہی کو وسیلہ بناتی ہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ سپردگی کے اور علائم و رموز نہیں ہیں۔ لیکن آنکھوں سے زیادہ بلیغ اور لطیف کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب چونکہ دیو داسی کی آنکھوں جنسی اور سپردگی کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوتی جو روح کے تسخیر ہو جانے کی علامت ہے۔ اس لئے اس کی روشن، ذہین اور چمکتی ہوئی آنکھیں جوبن کی رکھوالی کرتی ہیں۔ حسن کی پاسباں ہیں۔ دلبری کے رموز کی محافظ ہیں۔ آخری بند میں ؎

جمن کنارے پریم دوارے
برہ اداسی درشن پیاسی
دیوا داسی تن من ہارے
تنہا اپنے آپ کھڑی ہے۔ بت بن کر چپ چاپ کھڑی ہے۔

جمن کنارے اور پریم دوارے پھر بہت بلیغ ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ دیو داسی وہ تشنہ کام اور تفتیدہ لب راہرو ہے جو بظاہر دریا کے کنارے کھڑا ہے لیکن ہونٹ تر نہیں کر پاتا۔ پریم کی جمنا بہہ رہی ہے اور اسے ایک قطرہ نصیب نہیں ہوتا تشنگی۔ شانتی اور بھگتی کے دامن یعنی مندر میں اس کی روح مضطرب اور بے قرار رہتی ہے۔ اس سے زیادہ حرمان کا احساس اور کیسے ہوگا۔ اور یہی حرمان کا احساس ہے جس کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ؎ تنہا اپنے آپ کھڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تنہائی ذہنی اور روحانی ہے

ورنہ یوں تو صبح و شام دیوداسی سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہوگا۔ ۵ "اپنے آپ کھڑی ہے" کا ٹکڑا وضاحت سے کہتا ہے کہ وہ صرف اپنے سہارے کھڑی ہے۔ اس کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہیں۔ اس کو راہ بتانے والا کوئی نہیں۔ اور "بُت بن کر چپ چاپ کھڑی ہے" ساری نظم کی جان ہے۔ دیوداسی روز دیکھتی ہے کہ مندروں میں بُت جامد اور ساکت بُت، پتھروں کے ٹکڑے۔ بے حس، بے زبان، خاموش کس عقیدت اور محبت سے پُوجے جاتے ہیں محض اس لئے کہ وہ ایک تصوّر کی علامت ہیں۔ اور ذہنِ انسانی اس پتھر کے ٹکڑے سے ماوراء ہو کر اس تصوّر تک پہنچتا ہے جس کی وہ علامت ہیں۔ لیکن کیا عجیب بات ہے کہ کسی انسان کا ذہن اس بت کی تابندہ روح کو نہیں دیکھ سکتا جسے دیوداسی کہتے ہیں۔ یہ بت پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ ذی حس ہے۔ جاندار ہے۔ روح رکھتا ہے۔ پھر بھی اس کی پوجا کوئی نہیں کرتا۔ لوگ ماورائے طبعیات تصوّرات کو چھُو لیتے ہیں اور دیوداسی کی روح کو کوئی نہیں چھو پاتا۔ یہ کیا قیامت ہے۔ یہ بت جس کے اندر روح تابندہ ہے کب تک اپنے پجاری سے محروم رہے گا۔

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ بیسویں صدی میں انسانیت کے بہت سے اخلاقی، تمدّنی اور اقتصادی اقدار ایک کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جدید انکشافات کے باعث انسان کا شعور نہ صرف اپنی ذات کے متعلق گہرا ہو گیا۔ بلکہ وہ فطرت کے مظاہر و رموز سے بھی نسبتاً بہت زیادہ آگاہ ہو گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد تک ابھی ایک نیا تمدّنی مزاج متحجّر نہیں ہو چکا تھا۔ سائنس طب اور نفسیات میں تیزی سے ایسے انقلاب انگیز انکشافات ہو رہے تھے کہ یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ اب چشمِ تماشا کی لذّتِ دگر کا کیا عالم ہوگا۔ پرانی معاشرت پر نہ صرف شکست و ریخت کا عمل جاری ہو چکا تھا۔ بلکہ وہ ایک نئے سانچے میں بھی ڈھل چکی تھی۔ اگرچہ سانچے برابر بدل رہے تھے اور معاشرت نت نیا روپ اختیار کر رہی تھی۔ ان حالات میں شعر کی پُرانی اور کلاسیکی روایات قائم نہیں رہ سکتی تھیں۔ زندگی اور زندگی کے کوائف پیچ دار ہو گئے تھے۔ بنیادی مسائل چاہے وہی ہوں۔ لیکن ان سے شاخیں اتنی پھوٹ نکلی

تھیں گویا مسئلے کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ اس کے باوجود تاثیر کے زمانے کے کچھ شاعر عین اس طرح شعر کہتے جا رہے تھے گویا نہ اقتصادیات میں کوئی انقلاب برپا ہوا نہ معاشرے کا مزاج بدلا ہے۔ نہ تمدن کی اقدار تغیّر پذیر ہوئی ہیں۔ اِن لوگوں کو تو تاثیر نے درخور اعتنا نہیں جانا کہ اظہارِ مطالب میں دیانتداری بھی نہیں برتتے تھے۔ البتہ اُس نے جدید معاشرے کے پیچاک کو دیکھ کر پرانی معاشرت کی سادگی کو یاد کیا۔ اور ان شعراء پر رشک کا اظہار کیا جن کے مسائل نہایت سادہ اور جن کی زندگی خوب ٹکی بندھی تھی —— یہ نظم جس کا عنوان ہے "اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام" طنز کا بھی ایک کامیاب نمونہ ہے۔ اور بیسویں صدی کے شاعر کے ذہنی تذبذب کی بھی نہایت اچھی تصویر ہے۔ کسی نقّاد نے جنگِ عظیم کے بعد دنیا کی جو حالت ہو گئی تھی اُسے "Leaning Tower of pisa" سے تشبیہ دی تھی۔ کہ گرتا بھی نہیں اور جھکا ہوا بھی ہے۔ مُراد یہ تھی کہ پُرانی معاشرت کہیں ختم بھی ہو چکے تو آدمی اپنے آپ کو نئے تمدنی مزاج کے سانچے میں ڈھال لے۔ لیکن ہو یہ رہا تھا کہ نہ پُرانی دیواریں گرتی تھیں نہ نئی عمارت تعمیر ہوتی تھی۔ تاثیر کہتا ہے۔

★ کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
رات دن نغمہ ہائے چنگ و رباب
روز و شب گردشِ پیالہ و جام
ایک جانب رقیبِ بدکردار
ایک پہلو میں ساقیٔ گل فام
پھول تھے پھول - کانٹے کانٹے تھے
دانہ دانہ تھا اور دام تھا دام
ربط تھا زندگی کے حصّے میں

ل

ابتدا ار تھی الگ، الگ انجام

★ اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
شبِ مہتاب پائے ساقی پر
اپنا سر رکھ کے خوب سوتے تھے
صبح دم قطرہ ہائے شبنم سے
موتیوں کی لڑی پروتے تھے
پھول کو دیکھ کر چہکتے تھے
اور بلبل سے مل کے روتے تھے
کاٹتے تھے فراق کی راتیں
اور الفت کے بیج بوتے تھے
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام

★ آج دنیا کو وہ قرار کہاں
زندگی ہے کہ ساغرِ سرجوش
مغ بچے عابدانِ سبحہ بدست
مسجدوں کے امام بادہ فروش
رات سے دن کا امتیاز محال
صبح صادق ہے شام در آغوش

پھول اُلجھے ہوئے ہیں کانٹوں سے — بلبلیں پھر رہی ہیں دام بدوش
گا رہے ہیں طیور شاخ بہ شاخ — اور تاثیر سُن رہا ہے خموش
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام — کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے

وہ نظم جس کا عنوان ہے "یدِ بیضا" تاثیر کی عظمت کا سب سے بڑا نشان ہے۔ میں اس مختصر سے دیباچے میں اس حسین وجمیل نظم سے متعلق وضاحت سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس نظم کا نہ صرف پس منظر بہت عظیم ہے بلکہ ان الفاظ کے پردے میں محسوسات کا ایک دفترِ عظیم پنہاں ہے۔ اِس نظم کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کیا جائے مجھے مہلت نصیب ہوئی تو میں ایک علیحدہ مقالے میں اس نظم کے بارے میں اپنے احساسات کو پیش کرونگا فی الحال میں صرف یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ تاثیر نے اِس نظم کی توضیح سے متعلق اسی نظم کے ساتھ ایک تمہید قلم بند کی ہے لیکن میں اُنکی وضاحت سے مطمئن نہیں۔ شاعر خود کبھی اپنی عظمت کی پیمائش نہیں کر سکتا اور تاثیر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اُس نے ایک ایسی عدیم النظیر نظم لکھ دی ہے جو اربابِ نظر کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔ اردو زبان میں اتنی عمیق اور جامع نظم آجتک نہیں لکھی گئی۔ یہ میرا خیال ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنے اس خیال کی تائید میں اپنے آئندہ مقالے میں دلائل پیش کر سکوں گا۔ میری دانست میں تاثیر اگر صرف یہی ایک نظم لکھ کر ہم سے رخصت ہو جاتا تو پھر بھی اُردو زبان کے ممتاز ترین شعراء میں اسکا شمار ہوتا۔ تاثیر کو فنونِ لطیفہ سے خاص شغف تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ جمالیات کی تحقیق و تدقیق میں صرف کیا۔ فنکار کی عظمت، شوکت انکے دل و دماغ میں موجود تھی چنانچہ اپنے اکتساب کے تمام افکارِ حسین کو انہوں نے اس نظم میں سمویا ہے۔ اس نظم کی حسین علامتیں خوبصورت استعارے اور دلنشیں کنائے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تاثیر اپنے افکار کو مختلف جمالیاتی علامات کے ذریعے ظاہر کر رہے ہیں موسیقی، تصویر کشی، سنگتراشی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی علامات و تشبیہات اس نظم میں اِسطرح توضیحِ مطلب کیلئے استعمال کی گئی ہیں کہ انکی نظیر اُردو میں نظر نہیں آتی مجھے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوگا جبتک میں "یدِ بیضا" پر اپنی مفصل رائے ظاہر نہ کر دوں۔ اور اس کیلئے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر میرے چند احباب کو یہ شکایت ہو کہ میں اس دیباچہ میں تاثیر کی عظمت کے سارے نقوش پیش نہیں کر سکا تو یہ بجا ہوگا۔ کیونکہ تاثیر کی شخصیت کے پہلو اس قدر متنوع تھے کہ ایک فردِ واحد ان سے مشکل ہی سے انصاف کر سکتا ہے ؎

سید عابد علی عابدؔ

تشکر

خیال یہ تھا کہ میں تاثیر مرحوم کے اس مجموعہ کلام کی طباعت و اشاعت کسی ناشر کے سپرد کر دوں۔ ایک دو ناشروں سے گفتگو بھی ہوئی لیکن مجھے کوئی اطمینان بخش پہلو نظر نہ آیا جس کے باعث میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ میں "آتشکدہ" کی اشاعت خود ہی کروں گی۔

ظاہر ہے کہ میں زبان اور لیتھو کی طباعت کے مرحلوں سے ناواقف تھی۔ لیکن اس کے باوجود تاثیر کے دوستوں کے بھروسے پر میں نے یہ بیڑا اُٹھایا۔ طباعت کی منزلیں طے کرتے وقت مجھے پہلی دفعہ اس امر کا بھی احساس ہوا کہ ناشر کو کس قدر دِقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر احباب میری اعانت نہ کرتے تو یہ منزل کبھی طے نہ ہو سکتی۔

تاثیر کے کلام کے اِنتخاب میں تاثیر کے دوستوں میں آغاز ہیں اختلاف رونما ہوا۔ کچھ یہ کہتے تھے کہ تاثیر نے اپنی زندگی میں جو کچھ کہا ہے وہ سب شائع ہو جانا چاہیئے۔ دوسرے احباب یہ کہتے تھے کہ اِنتخاب لازمی ہے۔ موخرالذکر اصحاب کی رائے تسلیم کر لی گئی۔ اور بڑی درشتی سے کانٹ چھانٹ کی گئی اور زیر نظر مجموعہ مرتب ہوا۔ اس مجموعہ کی ضخامت کے برابر ابھی میرے پاس تاثیر کا کلام موجود ہے۔

تاثیر کے بے شمار احباب اور مداحوں کا یہ خیال تھا کہ تاثیر کی موت کے بعد یہ مجموعہ چھ ماہ کے اندر شائع ہو جائے گا۔ اور اس ضمن میں مجھ سے جس خلوص اور اصرار کے ساتھ استفسارات کئے گئے اس سے میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ اہلِ ذوق تاثیر کے کلام کو مجموعہ کی صورت میں دیکھنے کے لئے کس قدر بے تاب تھے ۔

بہر حال تاثیر کی موت کے اڑھائی برس بعد یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے اور میرے لئے تو شاید اب بھی ممکن نہ ہوتا اگر چند احباب میری اعانت نہ کرتے ——————،

کلام کے انتخاب کے سلسلے میں پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سعید اللہ، فیض، سالک، آفتاب احمد احمد حسین اور اسلامیہ کالج کے چند طلباء خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے بڑی کاوش کے بعد اس مجموعہ کو مرتب کیا ——،

مسٹر مشتاق احمد گورمانی وزیرِ امور داخلہ پاکستان کی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مجموعہ کی اشاعت میں خاص دل چسپی کا اظہار کیا۔ اور کاغذ کے حصول میں میری امداد کی۔

اپنی انتہائی مصروفیتوں کے باوجود سید عابد علی عابد نہ صرف وقتاً فوقتاً مجھے مشورے دیتے رہے بلکہ ایک سیر حاصل پیش لفظ بھی تحریر کیا۔ اور شدید علالت کے باوجود انہوں نے اس مجموعہ کی تکمیل میں ہر لحاظ سے میری امداد کی۔ ان کے شکریہ کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل سکتے ۔

ڈاکٹر نذیر احمد اور مجید ملک کی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مجموعہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میرا ہاتھ بٹایا ——————۔

خلیل احمد میرے خاوند کی زندگی کے آخری دور میں ہمیشہ اُن کے ساتھی رہے۔ خلیل صاحب

یدِ بیضا

تخلیق شعر ایک پُراسرار مگر قدرتی واردات ہے۔ یہ چند لوگوں کو ودیعت کی گئی ہے۔ اور اِن چند لوگوں کی زندگی کے چند لمحات ہی اِس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ الہام۔ آمد۔ تخلیق جو نام تجویز کیجیئے، مدّعا اسی عمل کی غیر شعوری کیفیت کو ظاہر کرنا ہے ۞

مصوّری، سنگ تراشی، موسیقی، ادب (ناول، شاعری) وغیرہ کا ایک ہی قبیلہ ہے۔ مگر مختلف خاندان ہیں اور اختلاف کا یہ حال ہے کہ کئی طباع شاعر مصوّری سے بے ذوق ہوتے ہیں اور کئی مصوّر ادب سے بے بہرہ علیٰ ہذالقیاس ۞

فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث میں بیشتر اُلجھنیں فنونِ جمیلہ کی تخلیقی واردات کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ فن کار کی اپنی زندگی کا منتہا تو فن ہی ہوتا ہے یہ فکر غیر فنکار کو ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں فن کا کیا مقام ہو ۞

فن کار کی زندگی فن ہے۔ اس کی زندگی ہی تلاش میں گزر جاتی ہے۔ مگر تلاش کے لفظ میں شعوری ارادیت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ آرزومندی، جستجو کی ارادیت جھلکتی ہے۔ تخلیقِ فن میں تلاشِ معاش کی سی تلاش نہیں ہوتی۔ زندگی کے عام کاروبار کی طرح اس میں بھی ایک طرح کی زحمت ہوتی ہے۔ مگر اس کی جراحت، اس کی خراش مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ ذرا سی ایک جراحت بھی طرب ناک ہوتی ہے ۞

خارجی اور داخلی دُنیا، نظر اور قلب کی دنیا کا مقامِ اِتّصال، فنکار کی شخصیت

ہے۔ یہ آرٹ کا مقام ہے۔ مقام کا لفظ بھی استعارہ ہے۔ یہاں احساس کا تنوع بھی وحدت اختیار کر لیتا ہے۔ باہر اور اندر کی دنیا ایک ہو جاتی ہے۔ نگاہِ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں۔

اس واردات تخلیق کو مقامِ طور کہہ لیجئے۔ لیکن یہاں کلام علمِ کلام کے زور سے نہیں۔ یہ منطق کی گفتگو نہیں۔ خیال تصور سے پاک، واردات تعینات سے بیباک ہے۔ ہوس عشق، یہ واردات کا مواد ہیں۔ عام موانعات کا یہاں اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر فن کا مقصد تخلیق جمال ہے تو یہ جمال محض مادی حسن نہیں۔ فغانی نے، ع بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست، صحیح کہا ہے۔ فنونِ جمیلہ کی دنیا جمالی واردات کی ترجمانی، مضمون اور اشیاء کی فہرست بنانے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ تو کاروباری معانی سے آزاد، اشکال و تفہیمات کی دنیا ہے۔ سوادِ قوس و نجم و گردشِ نشور و سرور۔

کاروباری دنیا میں ملکیت اور طبقات کی بحث ہے۔ مالک اور مملوک کا جھگڑا ہے۔ اجارہ داری پر فساد ہے۔ مگر آرٹ کی دنیا میں ہر کوئی اجارہ دار ہے مالک ہے۔ بقدر جام یہاں اذنِ عام ہے۔ سب کو ایک کا اجارہ دوسرے کو محروم نہیں کرتا۔ ایک روش دوسری روش کو ساقط نہیں کرتی۔ نیوٹن کو آئن سٹائن، ہٹلر کو سٹالن معزول کر دیتا ہے۔ شیکسپیئر کو برنارڈ شا سے کوئی خطرہ نہیں۔

مگر یہاں بھی کاروبار کے پہلو نکل آتے ہیں۔ افادیت رخنہ اندازی کرتی ہے۔ مدعا طلبی کی آلائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن کافر اور مومن کا فرق، شمعِ طاقِ حرم اور شرارِ بولہبی کا فرق شاعری میں پیدا نہیں ہوتا۔ ترقی پسندی اور رجعت پسندی ٹکسال باہر ہیں۔ رئیس پسند بالزاک، کفر پسند امراء القیس، دربار پسند غالب کی جانچ اور طرح کی جاتی ہے۔ اس دنیا کا منتہائے نظر، مآل کار وہ نہیں جو کاروباری دنیا کا ہے۔

نہیں، نہیں، کی تکرار، نازک جذبات، احساسات کی پرکھ، دیب و تشکیک یہ عالم دنیا داروں اور افادیت پرستوں کے ہاں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ مگر بساطِ کیف پر تو نفی کو بھی اثبات کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں خطوط اور نواہائے معرّا اشیا سے زیادہ جاندار ہیں۔ معانی کی جان اصوات کی جان سے ظاہر ہوتی ہے۔ سنگ تراش کی دنیا میں کس قدر طاقت ہے۔ عمود و قوس و محور اس فن کے "مضمون" ہیں۔ یہ مثبت مضمون ہیں۔ اِس دُنیا میں قلب و نظر اور عِلم و عمل میں نہ تضاد ہے نہ فساد ❊

اصوات و اشکال کے فنون، الفاظ و معانی کے فنون سے مختلف ہیں۔ خارجی اور داخلی دنیا کا اتصال شاعر کی شخصیت میں ہوتا ہے۔ اس شخصیت کی یکتائی، اس کی پہنائی حُسنِ فن ہے۔ محض نقالی، محض اظہارِ جذبات آرٹ نہیں۔ ایک منفرد شخصیت کی جمالی واردات سے آرٹ تخلیق ہوتا ہے۔ یہ خواص کی دُنیا ہے مگر اس کے کارناموں میں عمومیت ہے۔ مظاہرِ قدرت کے سامنے مصوّر اور مغنّی کی حیثیت اور ہے۔ اور شاعر کی اور ہے۔ اِس لئے کہ قدرت میں رنگ اور صوت ہے اور یہ مصوّر مغنّی کے ہتھیار بھی ہیں۔ شاعر کے الفاظ میں نہ لمس نہ رنگت، نہ ذائقہ، نہ مشام! مگر حروف کے پیوند، ستاروں کو توڑ کر آفتاب بنا دیتے ہیں، ان میں سب کچھ آجاتا ہے۔ شاعر کی شخصیت کے مطابق مادی مظاہر سے ماورے ❊

شاعری میں ترجمانی محض ذاتی زندگی کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ اسے نقالی کہنا تو کسی طرح صحیح نہیں تشبیہ جو شاعری کی جان ہے اس میں دو الگ تصورات کی الگ الگ حیثیت کچھ بھی نہیں، ان کا کھٹالی میں ایک ہو جانا، یہ کسی مادی واقعہ یا عام واقعات کی ترجمانی نہیں یہ تخلیقی عمل ہے۔ نہ ہونے سے ہونا، عدم سے وجود کا پیدا ہونا ❊

یہ کس طرح ہوتا ہے ——— یہ وہی طور کا مقام ہے۔ وہاں الہامی کیفیت کیا تھی؟ ذاتی زندگی، مادی حالات، مظاہر قدرت کی حیثیت کچھ نہیں طور اور موسیٰ دونوں غائب ہو گئے۔ مگر تخلیقی عمل سنگتراش کا ہاتھ، مصور کا ہاتھ، شاعر کا معجز کار قلم، ایک دہکتا ہوا نشان، ید بیضا فقط اسی کا وجود مرکزِ واردات رہا۔ یہی حاصل تماشا ہے۔ فن کار کی زندگی یہی ہے۔ اس کی زندگی فن ہے اور فن اسکی زندگی ہے۔ ادب برائے ادب صحیح ہے کہ ادب زندگی ہے ادب برائے زندگی صحیح ہے کہ زندگی ادب ہے

یہ نظم تخلیقی واردات کی تخلیقی واردات ہے، شاعری کی شاعری ہے۔ اہلِ سخن کا اعلان ایمان ہے۔ اس کی قدر شاعرانہ ہے۔ یہ شعر ہے۔ نظم ہے

یہی ہے کچھ بھی نہیں اور کائنات مری ——!

لے کی بدلتی ہوئی رفتار، متحرک تصویریں، اعلام و تشبیہات یعنی شاعری ——!

ذاتی خلوص، حدتِ جذبات، منفرد شخصیت، زندہ اقدار، یعنی شاعری :-

زندگی ، شاعری !

مجھے تلاش رہی ہے

نہیں تلاش نہیں

تلاش میں تو طلب

جستجو سی ہوتی ہے

دبی دبی ہی سہی
آرزو سی ہوتی ہے

نہ آرزو نہ طلب ہے نہ جستجو نہ تلاش
ذرا سی ایک جراحت ذرا سی ایک خراش

میانِ قلب و نظر اک مقام ہے اُس کا
مقام؟ مرحلہ؟ جو کچھ بھی نام ہے اُس کا

جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہِ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

وہ طورِ جلوہ معنی
وہ کارگاہِ کمال
تصورات کی آلائشوں سے پاک خیال
تعینات سے بے باک وارداتِ جمال

ہوس نہ عشق نہ منزل نہ سرحدیں نہ حدود

"جمال: تابشِ رُو، گرمیٔ خرام نہیں
ہزار ایسی ادائیں ہیں جِن کا نام نہیں"

یہ جھلکیاں

یہ ادائیں

یہ پرفشاں سائے

یہ جھلملاتے

اُبھرتے

دبے ہوئے سے نقوش

سوادِ قوس و خم و گردشِ نشور و سرور!

یہ کائنات مری کائنات ہو، یہ نہیں
ہر ایک بات مگر میری بات ہو، یہ نہیں

میں دن کو رات بتاؤں تو رات ہو، یہ نہیں

نہیں! مجھے یہ خلش یہ ہوس نہیں ہوتی
بقدرِ جام یہاں اذنِ عام ہے سب کو
یہ میکدہ ہے یہاں پیش و پس نہیں ہوتی
مگر کبھی کوئی گم گشتہ رہ نوردِ غزال
مری کمندِ نظر کا شکار ہو جائے!
حریمِ ناز کا پردہ صبا اُلٹ ڈالے
کسی کا رازِ دروں آشکار ہو جائے!

یہ مدّعا طلبی یہ نظر کی آلائش
یہ حسنِ رہ گذری یہ سرودِ نشترِ گہی
یہ شمعِ طاقِ حرم، یہ شرار بولہبی
یہ منتہائے نظر، یہ مآل کار نہیں

"نہیں، نہیں" کی یہ تکرار، ہر جگہ یہ "نہیں"
کہ جیسے علم و عمل میں تضاد ہو جائے
کہ جیسے قلب و نظر میں فساد ہو جائے
کہ جیسے ...... کیا میں کہوں!

یہ "نہیں" یہ تشبیہیں
یہ اعتقاد کے اثبات کی نفی سے نہیں
وفورِ شوق کی، جذبات کی کمی سے نہیں

بساطِ کیف ہے اک کارزارِ جوشِ نمود
روش روش ہمہ رامش، چمن چمن ہمہ رنگ
خطوطِ نسخ و مناشیر و سنبل و ریحاں
نوائے بربط و طنبورہ و دف و نے و چنگ
نمودِ سرِ لبِ اظہار و کوہ کن یک تن   ہزار پیکرِ شیریں فسردہ در رگِ سنگ

کسی نے مسندِ سنگِ سیہ پہ لی کروٹ
برنگ موج اُبھرنے لگے نشیب و فراز
کھُلا ہے ضربتِ تیشہ سے اک دریچۂ سرخ
قطار بستہ ہیولے کھڑے ہیں محوِ نیاز
عمودِ ہمّت و قوسِ نیاز و محورِ درد
بدن ڈھلے ہوئے انگڑائیوں میں لے بہ دست
تنے کسے ہوئے، سینے بلند سر بدست

شکارِ ماہ کہ تسخیرِ آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

وہ ایک اجنبی ساحل وہ شام تنہائی
حریفِ کثرتِ نظارہ دل کی یکتائی
جوابِ جوششِ دریا صدف کی پہنائی

وہ رنگ و صوت کا عالم، حواس کی دُنیا
وہ غور و فکر کی، خوف و ہراس کی دُنیا
وہ ماورے کا جہاں، آس پاس کی دُنیا

اُفق پہ وہ شفق آلودہ بادلوں کے ہجوم
مصوّروں نے لگائے ہیں نقش رنگ برنگ
مچی ہوئی ہے چٹانوں میں جلترنگ کی دھوم
مغنّیوں نے اڑائے ہیں موج کے آہنگ

مرے حروف، مرے لفظ، میرا طرزِ کلام
نہ ان میں لمس نہ رنگت، نہ ذائقہ نہ مشام
چمن کا رنگ نہیں ہے گہر کی آب نہیں
مگر وہ کیا ہے کہ جس کا یہاں جواب نہیں
حکایتِ غمِ دل، رُودادِ کون و مکاں

حدیثِ مطرب و مے حادثاتِ دورِ زماں
جمالِ زہرہ جبیناں، جلالِ کجکلہاں
یہ چند حرف یہ لفظوں کے جوڑ یہ پیوند
ردیف قافیہ و مثنوی و قطعہ و بند
"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"
مرا کلام ہے میرا کلام ہی لیکن
یہ میری بات جو ہے میری اپنی بات نہیں
معاملاتِ غزل ہیں معاملاتِ غزل
یہ آپ بیتی، یہ میرے معاملات نہیں
وہ صبحدم سرِ مژگاں لہو سے تر آنسو
وہ نوکِ خار پہ شبنم کے ارغواں قطرے

لرزلرز کے جو سنبھلیں، سنبھل سنبھل ڈھلکیں
تصوّرات کی آمیزشیں یہ تشبیہیں!

یہ واقعات نہیں ہیں یہ واردات نہیں
یہ اور بات ہے قلب و نظر کی بات نہیں

کلیم غش میں گرا، طور جل کے خاک ہُوا
نظر کی بات رہی اور نہ دل کی بات رہی
شہود و شاہد و مشہود کے حدود کہاں
نہ اِسکی ذات رہی اور نہ اُسکی ذات رہی

مگر وہ ایک دمکتا ہُوا نشاں کہ جو ہے
متاعِ عرض تماشا بس اور کچھ بھی نہیں
وہی کہ جس سے درخشاں ہے خاکنائے حیات
وہی کہ جس سے ہے لمحاتِ زندگی کو ثبات

وہی حیات کا مقصد وہی بنائے حیات
وہی کہ ہے یدِ بیضا بس اور کچھ بھی نہیں

یہی ہے کچھ بھی نہیں اور کائنات مری
مری حیات ادب ہے ادب حیات مری

میانِ قلب و نظر اک مقام ہے اس کا
مقام؟ مرحلہ؟ جو کچھ بھی نام ہے اس کا

جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہِ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

★

فرار

(محاورہ مابین شاعر و ضمیرِ کائنات)

مجھے حاصل ہیں دنیا کے مراتب مال و دولت بھی
گوارا میری سیرت ہے گوارا میری صورت بھی
میسّر ہے خمارِ عشرت و کیفِ محبّت بھی

تو پھر یہ مُردنی کیوں چھا رہی ہے میری دنیا پر

تجھے حاصل ہے سب کچھ پھر بھی غم بے حاصلی کا ہے
یہ غم تیرا بجا ہے یہ ترا احساس سچا ہے
کہ جیتا جاگتا ہے تو کہ تیرا قلب زندہ ہے

مگر اک مردنی چھائی ہوئی ہے تیری دُنیا پر

مَیں گھل مِل جاؤنگا یوں خاکساروں بے نواؤں میں
بدل ڈالوں گا سب احکام اپنے اِلتجاؤں میں
میں اپنا مال و دولت بانٹ ڈالونگا گداؤں میں
کرے گا طعن کوئی کس طرح پھر میری دُنیا پر

غریبوں کی غریبی کیا مِٹے گی اِن نوالوں سے
نپٹ سکتا نہیں تو اس طرح سرمائے والوں سے
الگ بالکل ہے تیرا مسئلہ ان سب سوالوں سے
کہ تیری اپنی دنیا طعنہ زن ہے تیری دُنیا پر

کروں گا اپنا گھر آباد میں اِک اور دنیا میں
کنارِ آب رُکنا آباد و گلگشتِ مصلےٰ میں
کِسی آباد بستی میں کِسی آزاد صحرا میں
نہ ہوگا پھر کِسی کا بھی تسلّط میری دنیا پر

جہاں بھی جائے گا تو تیری دنیا ساتھ جائے گی
نہ چھوڑے گی کبھی تجھ کو یہ تنہا ساتھ جائے گی
یہی حسرت یہی تیری تمنّا ساتھ جائے گی
رہے گا تیری دنیا کا تسلّط تیری دُنیا پر

میں دنیا چھوڑ دوں گا میں خدا سے لَو لگاؤں گا
صنم خانوں کے ایوانوں میں قندیلیں جلاؤں گا
کلیساؤں کے محرابوں میں اپنا سر جھکاؤں گا
خدا کے عرش کا سایہ رہے گا میری دُنیا پر

تو چاہے بھی تو پرچھائیں سے دِل بہلا نہیں سکتا
خدا کا نور بھی آنکھیں تیری چندھیا نہیں سکتا
جسے تو سچ سمجھتا ہے اُسے جھٹلا نہیں سکتا
اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے تیری دنیا پر

مری ظلمت کو چمکا دے گی طلعت مہ جبینوں کی
حصارِ عافیت بن جائیں گی باہیں حسینوں کی
غموں کو محو کر دے گی مسرّت ہم نشینوں کی
خوشی کے پھول برسیں گے ہمیشہ میری دُنیا پر

تمناؤں میں اُلجھاتا رہے گا دِل کو تو کب تک
کھلونے دے کے بہلاتا رہیگا دِل کو تو کب تک
خلافِ عقل منواتا رہے گا دل کو تو کب تک
ہوس کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں تیری دُنیا پر

نرالی ہے زمانے سے مرے افکار کی دُنیا
حسینوں سے حسیں تر ہے مرے اشعار کی دُنیا
شبِ مہتاب کی دنیا مہِ رخسار کی دُنیا
یہی انوار نکہت بار ہوں گے میری دُنیا پر

چھپا رکھے گا خوابوں میں کہاں تک تو حقیقت کو
دبا رکھے گا لفظوں میں کہاں تک تو صداقت کو
یہ پردے اور بے پردہ کریں گے تیری فطرت کو
تری فطرت رہے گی سایہ افگن تیری دُنیا پر

تو میں تیغ و کفن باندھے ہوئے کو دوں گا میداں میں
حیاتِ جاوداں پنہاں ہے آبِ تیغِ برّاں میں
بہار آجائے شاید اس طرح میرے گلستاں میں
خزاں چھائی ہوئی ہے مدتوں سے میری دُنیا پر

بہار آئی نہ ہو جس باغ میں اسکی خزاں کیسی
ترا جینا بھی مرنا ہے حیاتِ جاوداں کیسی
یہ تلواریں کہاں کی ہیں، یہ ترکش کیا کماں کیسی
ابد کی موت طاری ہو چکی ہے تیری دُنیا پر

نہ جینے کی ہوس باقی نہ مرنے کا خطر دل میں
بھٹکتے پھرتے ہیں رہرو غبارِ راہِ منزل میں
ابھی لیلائے مستقبل چھپی بیٹھی ہے محمل میں
ابھی کچھ دیر تاریکی رہے گی ساری دنیا پر

★

اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام

کِس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام!
رات دن نغمہ ہائے چنگ و رباب
روز و شب گردشِ پیالہ و جام
ایک جانب رقیبِ بد کردار
ایک پہلو میں ساقیِ گلفام
پھُول تھے پھُول۔ کانٹے کانٹے تھے
دانہ دانہ تھا، اور دام تھا دام
ربط تھا زندگی کے قصّے میں
ابتدا تھی الگ، الگ انجام

اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
کِس قدر خوش نصیب ہوتے تھے

شبِ ماہتاب، پائے ساقی پر
اپنا سر رکھ کے خوب سوتے تھے

صبح دم قطرہ ہائے شبنم سے
موتیوں کی لڑی پروتے تھے

پھُول کو دیکھ کر چہکتے تھے
اور بُلبُل سے مِل کے روتے تھے

کاٹتے تھے فراق کی راتیں
اور اُلفت کے بیج بوتے تھے

کِس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام!—

آج دنیا کو وہ قرار کہاں
زندگی ہے کہ ساغرِ سر جوش
مُغبچے عابدانِ سبحہ بدست
مسجدوں کے امام بادہ فروش
رات سے دِن کا امتیاز محال
صبحِ صادق ہے شام در آغوش
پھُول اُلجھے ہوئے ہیں کانٹوں سے
بلبلیں پھر رہی ہیں دام بدوش
گا رہے ہیں طیور شاخ بہ شاخ
اور تاثیر سُن رہا ہے خموش!۔

اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے!۔

○

آداب سے مجبور اگر ہو بھی گئے ہم
ہنستے ہوئے موسم کی کوئی بات کرینگے

تاویل ستم، عذرِ جفا لاکھ کریں وہ
ہم تذکرۂ لطف و عنایات کریں گے

دن ہو گئے دشوار تو اوراد و وظائف
راتیں ہوئیں مشکل تو عبادات کریں گے
آنسو نہ تھمیں گے تو منائیں گے محرّم
نالے نہ رُکیں گے تو مناجات کریں گے

طے ہو گیا ہم ترکِ ملاقات کریں گے
جس طرح بھی ہو گی گزر اوقات کریں گے

★

رس بھرے ہونٹ

رس بھرے ہونٹ۔ پھول سے ہلکے
جیسے بلّور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفقِ صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے، سنبھل سنبھل ڈھلکے
رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں
یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی

رات دن کے تھکے ہوئے راہی

پاؤں چھلنی نگاہ متزلزل

وقت صحرائے بیکراں کہ جہاں

سنگِ منزل نما نہ آج نہ کل

دفعتاً دُور — دُور — آنکھ سے دُور

شفق شام کی سیاہی میں

قلب کی آرزو نگاہی میں

فرش سے عرش تک جھلک اٹھے

ایک دھوکا سرابِ منبعٔ نور

رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیرؔ

رات دن کے تھکے ہوئے راہی

یوں لرزتے ہیں یُوں ترستے ہیں

جل رہے ہیں چراغ مندر میں

(۱)

ایک اک کرکے سوتے جاتے ہیں رات بھر جاگ جاگ کر تارے

دیوتاؤں کی ریت کے دن ہیں

رتجگے ہو رہے ہیں گھر گھر میں

پک رہے ہیں شرادھ کے پکوان

جل رہے ہیں چراغ مندر میں

۲

سرخ ساری کا کیسری آنچل
جھٹپٹے وقت جگمگاتا ہوا
سرخ پاؤں میں نقرئی چھاگل
سبز کھیتوں میں گیت گاتا ہوا

جل رہے ہیں چراغ مندر میں

۳

آ رہی ہے ہوا کے جھونکوں پر
ہلکی ہلکی سی رقص کی آواز
دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے
سازِ بے نغمہ، نغمۂ بے ساز

جل رہے ہیں چراغ مندر میں

۴

دیوتاؤں نے کھول دیں آنکھیں
لمبی لمبی گھنی پلکیں
کالی کالی حسیں آنکھیں

جل رہے ہیں چراغ مندر میں

رقصِ حیات

مینِ شب کی برنجی صُورت کو دیکھکر

رقص کی رُوح کائنات میں ہے
ٹہنی ٹہنی میں پات پات میں ہے

پھُوٹ کر بہہ رہی ہے جانِ بہار
ذرّہ ذرّہ ہے رقص سے سرشار

ہے محبّت میں چور پروانہ
جھومتا پھر رہا ہے مستانہ

شمع کے آس پاس رقصاں ہے
رقصاں رقصاں ہے لرزاں لرزاں ہے

باغ میں بھی یہی ہے افسانہ
تیتری بن گئی ہے پروانہ

آتشِ گل سے ہے شرر ساماں
اس طرف، اس طرف ہے سرگرداں

پھول بھی مست اہتزاز میں ہے — غرق کیفیت نیاز میں ہے
اور کوئی ایک پھول رقصاں ہے — باغ کا عرض و طول رقصاں ہے
رقص کا کھل گیا ہے میخانہ — کوئی دیوانہ ہے نہ فرزانہ
ہیں بہت لوگ سیرگاہوں میں، — ناچتے پھر رہے ہیں راہوں میں
دشمن ہوش ہے فضا ساری — حشر بردوش ہے فضا ساری
اس فضائے حشر اور ساماں میں — اس ہوائے جنوں فروزاں میں
آئی نکل کے ایک دوشیزہ — جیسے بادِ شمال کا جھونکا
ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہے — موج کی طرح بڑھتی آتی ہے
مے ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے — شاخ کی طرح پیچ کھائے ہوئے
ناچتی ہے انہیں نچاتی ہے — منہ سے کچھ بولتی نہ گاتی ہے

اپنے نغموں سے آپ ہی مدہوش
اک مسلسل ترانۂ خاموش

بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

دھواں دھار مژگاں
ستارہ سی آنکھیں
جوانی سے شاداب لب، بھیگے بھیگے
چنبیلی کی کونپل پہ شبنم کے قطرے
ہرے کھیت، چشمے! ——
یہ مژگاں، یہ آنکھیں، یہ لب، پیارے پیارے
نظر کے ستارے، ہنسی کے شرارے،
"بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
ہجومِ تمنّا سے ناچار ہیں ہم!" ——

———III———

ملسینہ ہارون

(۱)

حسن اور محبت

ناپائداری

حسن اور جوانی

بے اختیاری

شبنم کے موتی بادِ بہاری

ملسینہ ہارُن!

○

(۲)

دُنیا کی شوکت

ثروت امیری

دُنیائے الفت

غربت فقیری

صحرا کی منزل۔ بے دستگیری

ملسینہ ہارُن

○

(۳)

دریا کا طوفان

مایوس، آہیں

شب کی سیاہی

تاریک راہیں

قدموں میں لغزش، حیران نگاہیں

ملیحہ ہارون

○

(۴)

اِک تنگ نالے

سب کچھ بہائے

لے جا رہی ہے

دو سرو خاموش

اِک اِس کنارے، اِک اُس کنارے

بادِ بہاری

لہروں سے مل کر

کچھ گا رہی ہے

ملیحہ ہارون ! ملیحہ ہارون

○

دہقانی بول

رنگ رنگیلا چھوکرا نئی نویلی نار
اک پہنے سونے کا کنٹھا اک پھولوں کا ہار
مرے راجا
اک پھولوں کا ہار

گورا سینہ گورا جوبن گورے گورے گال
جانے کس نے کیا کہا آنکھیں ہو گئیں لال
مرے راجا
آنکھیں ہو گئیں لال

ساری کا پلّہ بل کھائے جیسے کالا ناگ

زلفیں بکھریں دھواں اٹھا مکھڑا جلتی آگ

مرے راجا
مکھڑا جلتی آگ

بال سنوارے مانگ نکالی خوب بھرا سیندور

یونہی سہاگن بن بن بیٹھے پیا ہے کوسوں دور

مرے راجا
پیا ہے کوسوں دور

اُڑنے سے پہلے پنچھی جیسے پر پھڑکائے

اپنا جوبن اپنے ہاتھوں یوں گوری مٹکائے

مرے راجا
یوں گوری مٹکائے

عشق ہمارا دین دھرم ہے عشق ہماری ذات

تو بھی ہو دکھ کیا سمجھیں تاثیر کے من کی بات

مرے راجا
تاثیر کے من کی بات

دیوداسی

بال سنوارے مانگ نکالے
دوہرا تہرا آنچل ڈالے
ناک میں بندی کان میں بالے
جگمگ جگمگ کرنے والے

ماتھے پر چندن کا ٹیکا
آنکھ میں انجن پھیکا پھیکا
مدھ ماتی متوالی آنکھیں
جوبن کی رکھوالی آنکھیں

آنکھ جھکائے لَٹ چھٹکائے

جانے کس کی لگن لگائے؟

جمن کنارے، پریم دوارے

برہ اداسی - درشن پیاسی

دیوا داسی - تن من ہارے

تنہا اپنے آپ کھڑی ہے

بُت بن کر چُپ چاپ کھڑی ہے

○

مگر ایک دِل

(ہائنے کی ایک نظم کا لفظی ترجمہ)

یہ رنگت ہے کہ گُل شرما گیا ہے   نہیں شبنم پسینہ آ گیا ہے
نگاہیں ہیں کہ بجلی ہے کہ سیماب   فلک بھی دیکھ کر چکرا گیا ہے
یہ اُبھرا آ رہا ہے تیرا جوبن   کہ طغیانی پہ دریا آ گیا ہے
بہارِ بے خزاں ہے تو سراپا
مگر اک دِل ترا مرجھا گیا ہے!

○

تُو

بہت میں نے گائے محبت کے گیت   کہ یہ شاعروں کی پرانی ہے ریت
کبھی میں نے ہر ایک کے دل کی بات   ہر اک کی، بد و نیک کے۔ دل کی بات
نئی لے نئی دھن سناتا رہا
مگر راز تیرا چھپاتا رہا
ستاروں کے نغمے ہواؤں کا زور   گلوں کی مہک آبشاروں کا زور
خمارِ خزاں و سرورِ بہار   ہیں نظمیں مری سب کی آئینہ دار
زمانے کا ہر راز مذکور ہے
مگر نام تک تیرا مستور ہے

ترا راز گو میں بتاتا نہیں — زباں پر ترا نام آتا نہیں
مگر کیا نہاں ہے مرا رازِ عشق؛ — ابھی تک ہے، کیا، بے صدا سازِ عشق؛
مَیں گاتا ہوں جب سوزِ الفت کے راگ — لگاتا ہوں اوروں کے سینوں میں آگ
سمجھتے ہیں کیا۔ مجھ کو سب دیدہ ور — غمِ قیس و فرہاد میں نوحہ گر

نہیں جانتے کیا کہ لیلٰے ہے تُو؛
مرا منتہائے تمنّا ہے تُو

○

دُنیائے دِل

رات کی ہیں ہزار ہا آنکھیں اور دن کی ہے ایک آنکھ مگر
جوں ہی سورج کا رنگ زرد ہُوا رُوئے تابندہ مثل گرد ہُوا
مُردنی چھا گئی ہے دُنیا پہ

عقل کی ہیں ہزار ہا آنکھیں اور دل کی ہے ایک آنکھ مگر
جونہی دل عاشقی سے سرد ہُوا اور نا آشنائے درد ہُوا
مُردنی چھا گئی ہے دُنیا پہ

○

حقیقتِ معصیت

پھینک دے دریا میں چپّو ہم نشیں — بے عناں جانے دے رہوارِ خیال
فطرتِ آزاد کو تعلیمِ ضبط! — پائے چوبیں بہرِ تمکینِ غزال
اپنی شخصیّت سے کیا ہو آگہی — ضبط نے جب کی ہو فطرت پائمال

یہ حقیقت میں کہیں پستی نہ ہو — آزمایا چاہیئے اوجِ کمال
کیا نہیں ہے کوئی حدِّ ممکنات؟ — چاہتا ہے تجزیہ لفظِ "محال"
تو کہ ہے زنجیریٔ الفاظ بُن — عرش کی رفعت پہ ہے پائے خیال
ہے تصوّر اس جگہ پر زَن جہاں — ارتقاء کا دوسرا رُخ ہے زوال

معصیّت جس سے ہے تجھ کو احتراز ۔۔۔ یہ نئی ہے ایک دنیائے خیال
کیوں سمجھتا ہے گنہ کو عیب تُو ۔۔۔ کچھ نہ کچھ خوبی ہے اس میں لامحال
ورنہ تخلیقِ گنہ تیرے لئے ۔۔۔ ایک بن جائے گا لاینحل سوال

اوسکر نے سچ کہا ہے معصیّت ۔۔۔ نیک لوگوں کی ہے تصویرِ خیال
یعنی ایسی آرزوؤں کا ہے نام ۔۔۔ جن کا بر لانا ہے اک امرِ محال

خوشنما کیوں معصیت ہے اس قدر؟ ۔۔۔ میں نے مانا زشت ہے اس کا مآل
یہ بُرائی کیوں ہر اک خوبی میں ہے؟ ۔۔۔ معصیت افزا ہیں کیوں حُسن و جمال؟
یہ نہیں دستورِ قدرت کا۔ کہ ہو ۔۔۔ مغزِ حنظل کے لئے شیریں سفال؟

معصیت کایں آتشیں انجام ہست
پختہ سازِ طبعِ مردِ خام ہست

ایک ترک شاعر کا کلام

خلیل کو امریکہ میں وہی مقبولیت حاصل ہے جو ٹیگور کو یورپ میں ہے۔ خلیل کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو کبھی نہیں بھولتا اور اسی لئے کئی نامحرمانِ راز اس کی حقیقت نگاری کو نشتر زنی (Sonnets) تصور کرتے ہیں۔ میں نے حتی المقدور لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں جو مشکلیں ہیں اُن سے صاحبانِ فن بخوبی واقف ہیں۔ — تاثیر

دورِ حیات

گیاہِ سبزِ گلشن نے بگڑ کر　　کہا اِک زرد روِ برگِ خزاں سے

سُن اے برہمن بزمِ تخیل　　نہیں کچھ فائدہ آہ وفغاں سے
تیرے گرنے میں ہے شورِ قیامت　　یہ حشر انگیزیاں سیکھی کہاں سے

جگایا ہے مجھے خوابِ گراں سے
کیا محرومِ عیشِ جاوداں سے!

کہا برگِ خزاں نے لال ہو کر　　ٹھکانا ہے تیرا تحتِ ثرے میں
تجھے بیگانگی سازِ طرب سے　　تلاشِ نغمہ مجھ کو ہر صدا میں
سُن اے آشنائے رمزِ ہستی　　ہے لطفِ زندگی میری نوا میں

جگا کر تجھ کو اس خوابِ گراں سے
کیا آگاہ عیشِ جاوداں سے

یونہی چلتا رہا دورِ آسماں کا　　گیا مٹی میں مل پتہ خزاں کا
بہار آئی ہوئی ہر روح تازہ　　بنا پتہ خزاں کا سبز تنکا
مگر دورِ تسلسل زندگی کا　　سکوں دنیا میں کب ہے لینے دیتا

خزاں پھر آگئی اور ٹہنیوں سے   جُدا ہونے لگا ہر پتہ پتہ
وہ برگِ زرد یعنی سبز تنکا   یہ پت جھڑ دیکھ کر پتّوں سے بولا

جگایا ہے مجھے خوابِ گراں سے
کیا محروم عیشِ جاوداں سے

ترجمہ

O

خطاب بہ یکے از شعرائے معاصرین

یہ بہاریہ قصیدہ فیضی کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔ اردو میں سودا اور ذوق نے بھی اسی زمین میں سخن وری کی ہے

یہ جوشِ مستیٔ خامہ کا ہے دمِ تحریر — بہ رنگِ قلقلِ مینا ہیں نغمہ ہائے صریر

نسیمِ باغ میں ایسا ہے کیفِ عالمگیر — کہ شاخِ گل کو سمجھتے ہیں دستِ ساغر گیر

نشاطِ موسمِ ابرِ بہار مت پوچھو — کہ جوشِ رنگ سے دنیا ہے عالمِ تصویر

چمن ہے میکدہ، ساقی صبا ہے، گل ساغر — اٹھا ہے سر پہ لئے خم کدہ جو ابرِ مطیر

زبسکہ بادِ صبا بھی ہے تاک پروردہ — ہیں مستِ بادۂ انگور سب صغیر و کبیر

ہر ایک گوشہ گلشن نشاط خانہ ہے — ہر ایک برگِ چمن ہے بہار کی تصویر

صبا کی تیز روی سے بلندِ طبلِ جدال — صبا کی تند روی سے سحر درفشِ صریر

نشاط و رنج ہیں ذہنی، بہار میں یکساں — ہے رقصِ شاخِ گل و اضطرابِ مرغِ اسیر

جہاں بھر میں ہے وہ جوشِ انبساط کہ ہے / کلیدِ قفلِ دل و شرحِ خاطرِ دلگیر

مگر نہیں ہے ترے حال میں کوئی تغییر / بنا ہے تو وہی حسرت و ملال کی تصویر

ترا شعار وہی ہے سکوتِ سودائی / جنوں نواز فزوں تر ہے تو دمِ تقریر

دلیلِ رنگِ طبیعت ہیں خونفشاں آنکھیں / ہے تیرا چاک گریباں جنون کی تصویر

ترے کلام کے صدقے سکوت قدرت کا / ترے سکوت کے قربان نغمۂ بم و زیر

وہ باکمال نہیں ہیں جو علم کا زیور / سمجھتے ہیں رہ و رسمِ عوام کی زنجیر

مرے خیال میں جو ہو عوام میں مقبول / ضرور ہے کہ حقیقت میں ہو وہ مردِ حقیر

کوئی نہ کوئی ہے خامی عیاں ہو یا پنہاں / کہ احمقوں میں جو ہوتی ہے باعثِ تشہیر

خواص کے لئے شہرت نہیں کوئی معیار / نہیں دلیلِ فضیلت شمارِ جمِّ غفیر

ترے کمال کا مجھکو ثبوت کافی ہے / نہیں عوام کی نظروں میں جو تری توقیر

بزیرِ سایۂ گل عندلیب مُرد فشرد

مگر ز اہلِ چمن ہیچ کس نہ گشت خبیر

آتش

خورشید کمند صبح بہ بام افگند
کیخسرو روز مہرہ در جام افگند
مے خور کہ منادی سحر گہ خیزاں
آوازۂ "اشربوا" ایام افگند ... ... عمر خیام

اب جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ سب بہہ نکلی ہے جو جام تھا پارا پارا ہے
مشرق کا شکاری اٹھا ہے، کرنوں کی کمندیں پھینکی ہیں
اک پیچ میں قصرِ اسکندر۔ اک پیچ میں قصرِ دارا ہے

ہاں دیکھ کہ میخواروں کے من میں کیسی موج سمائی ہے
شیشوں کو کیا ہے چورا چورا مے کو آگ لگائی ہے
شعلے لرزاں، لرزاں رقصاں۔ رقصاں ہے ہر ذرّہ ذرّہ
فرشِ زمیں سے عرشِ بریں تک ایسی جوت جگائی ہے

o

عندلیب

وُہ روز و شب بدل گئے　　خزاں کے دن نکل گئے

خوشی کا دور آگیا

زمانہ اور آگیا

تو پھر میں بے بصر ہوں کیا؟　　شکستہ اِس قدر ہوں کیا؟

کہ نغمہ زن نہ ہو سکوں　　کہ جان و دل نہ کھو سکوں

خوشی سے خود نہ رو سکوں

جگر میں پھانس ہے تو کیا　　بہار جلوہ گر تو ہے

میں نامرادِ غم سہی　　امید بارور تو ہے

شکستہ ہے تو کیا ہوا　　اڑے گا یہ کہ پر تو ہے

یہی شکستہ پر مرا

سوئے بہار لے چلا

لو دیکھنا یہی مجھے

فلک کے پار لے چلا

نغمے

نرالی صورتوں والے، نرالے ہیں حسیں نغمے — کئی عشرت فزا نغمے، کئی اندوہ گیں نغمے
وہ چشموں کی نوا ریزی، ستاروں کی ہم آہنگی — جدھر دیکھو ہیں بالائے فلک، زیرِ زمیں نغمے
سرِ کوہسار، گوہر رنگ گوہر ریز برفوں میں — ہوائے آبگوں کے سرو قد، بالا نشیں نغمے!
کسی مسحور قلعے کے، کسی تاریک گوشے میں — کسی محصورِ غم کے، مضمحل اندوہگیں نغمے!
کہیں دم توڑنے والوں کی بالا خیز فریاد میں — کہیں گردابِ سیلابِ اجل کے تہہ نشیں نغمے!

کشادہ بال و پر کیسا، بچھا ہو دام جب ایسا
کہیں نور اور کہیں نکہت، کہیں رنگ اور کہیں نغمے!

○

"یہ اور وہ"

مجھ پر کر دیتی ہیں جادُو
شکلیں اچھی اچھی خوشرو
چاند کا پرتو آبِ جو میں — اور تو
شکلیں اچھی اچھی خوشرو

• •

اف یہ موسم یہ برساتیں
یاد آتی ہیں پھر وہ باتیں
بھولے بسرے موہن نغمے — راتیں
یاد آتی ہیں پھر وہ باتیں

• •

چھا جاتی ہے مجھ پہ ہیبت
اللہ اللہ تیری قدرت
گہری جھیلیں، اونچے، اونچے — پربت
اللہ اللہ تیری قدرت

• • •

مجھ کو تنہا رہنے دو ۔۔۔!

مجھ کو تنہا رہنے دو، تم اپنے حال پہ رہنے دو
خوش رہتا ہوں اچھا ہوں میں، دکھ سہتا ہوں سہنے دو
مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو

میرے دل کی آگ بجھا دی آہیں بھرنے والوں نے
میری ٹھنڈک کھو دی ہے ان الفت کرنیوالوں نے
مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو

مجھ کو مجھ سے چھین لیا ہے میرے اپنے پیاروں نے
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے پریم بھری تلواروں نے
مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو

ڈھانپ لیا ہے میرا تن من نازک پردوں میں
چھوڑ دو مجھ کو دم گھٹتا ہے میرا تم ہمدردوں میں
مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو

قید کیا ہے تم نے مجھ کو الفت کے بت خانے میں
محو ہوا جاتا ہوں اب میں آپ اپنے افسانے میں
مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو

چار طرف سے گھیر لیا میں تم میں کھویا جاتا ہوں
اب میں اپنی آنکھ سے بھی اوجھل ہوتا جاتا ہوں
مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو

میری اک تصویر خیالی تم نے آپ بنائی ہے
مجھ سے تم کو پیار نہیں ہے اپنی مورت پیاری ہے

○

نغمہ شب

میں نے تاروں سے شب کو پوچھا ہے کوئی تحفہ کسی کے قابل!
زمیں سے تا آسماں خموشی یہ کہہ رہی تھی سکوتِ کامل!

سکوت کامل میں چلنے والے محیط دریا سے میں نے پوچھا،
کہ تیرے دامن بھرے ہوئے ہیں،
زر و جواہر لدے ہوئے ہیں!
مگر، ہے گہرائیوں میں تیری،
کوئی بھی تحفہ کسی کے قابل؟!
فضائے تاریک و تار دنیا
یہ کہہ رہی تھی سکوت کامل

سکوت کامل! سکوت کامل
یہ کون تحفہ ہے کس کے قابل؟!

میں ان کو نغمے سنا سکوں گا!
میں آہ و زاری بپا کروں گا!
میں ہر طرح حالِ دل کہونگا
مگر خموشی! سکوتِ کامل

یہ مجھ سے اسے دل نہ ہو سکیگا!
سکوتِ کامل نہ ہو سکے گا!

○

جگاوا

سُورج خون میں لتھڑا پتھرا
رکتا تھمتا گرتا پڑتا
لیٹ گیا انگڑائیاں لیتا

آؤ تم بھی سو جاؤ ـــــ مت دیکھو یہ خونیں منظر
آنکھیں بند کرو سو جاؤ

لمبے لمبے کالے کالے
سائے بالوں کو لٹکائے
خونی ہاتھوں کو پھیلائے

آتے ہیں! ـــــ وہ آئے وہ آئے

سایوں کی زنجیریں پھیلیں
سایوں کی شمشیریں پھیلیں
تقدیریں تدبیریں پھیلیں

یہ آوازیں ؛ ہائیں ہائیں
آگے پیچھے ! ہائیں ہائیں
دھائیں دھائیں ، دھائیں دھائیں

ایسا چھایا ہے اندھیارا
میرا ہے کوئی نا تیرا

توپیں ہیں یا دل کی دھڑکن
اٹھو سونے والو اٹھو !

سو جاؤ تم - سو جاؤ تم
آنکھیں بند کرو سو جاؤ

رات ہوئی شعلوں سے روشن
آنکھیں کھولو ! آنکھیں کھولو !

خونیں آنکھوں والے شعلے
برچھے بھالے لے کر نکلے
عفریتوں کا لشکر آیا
ساری بستی پر ہے چھایا

اُٹھو سونے والو اُٹھو ——— آنکھیں کھولو آنکھیں کھولو !

چمبہ کے اِک پہاڑی نالہ سے خطاب

اے نوا سر نوحہ زن ہے کیا غمِ ایام میں
درد پیدا کر دیا تو نے سکونِ شام میں

پتھروں سے سر کو ٹکراتا ہوا آتا ہے تو
مضطرب اتنا کہ بل کھاتا ہوا آتا ہے تو

سینہ کاوی اس قدر کی ہے کہ زہر آب ہے
لرزاں لرزاں ہوں کہ تو پانی نہیں سیماب ہے

گریۂ پیہم سے اب شرحِ تمنا ہو گئی
یعنی پتھر کے بھی دل میں راہ پیدا ہو گئی

سامنے وادی کے اس جانب ہے راوی آہ گیر
وہ یہاں سے سو قدم پر ایک چاندی کی لکیر

جاودانی وصل کے نغمے سناتی ہے تجھے
شادماں ہو تو کہ خود منزل بلاتی ہے تجھے

ایک میں ہوں دور افتادہ وطن کی راہ سے
عندلیب زار، واماندہ چمن کی راہ سے

میرا سر برسوں کسی کے آستاں پر خم رہا
میرا وہ محرم رہا اور اس کا میں محرم رہا

اب مری آنکھوں کے آگے اک مسلسل رات ہے
میں ہی میں ہوں اور کوئی ہے تو خدا کی ذات ہے

کاش ہوتا ہی نہ زخمِ عشق کو مرہم نصیب
رنج تو یہ ہے کہ شاداں تھا کبھی میں غم نصیب

وصل کیسا، آرزوے وصل تک معدوم ہے
شادمانی کے تصور سے بھی دل محروم ہے

دل تو روتا ہے مرا۔ آنکھیں مگر پُرنم نہیں
اس طرح بیٹھا ہوں جیسے مجھ کو کوئی غم نہیں

تو مگر اس عارضی فرقت پہ ہے محشر بدوش
رسمِ الفت خود فراموشی ہے اور تو خود فروش

جان تجھ کو کتنی پیاری ہے کہ ہے یوں نوحہ زن
یا ز جاناں یا ز جاں بایست دل برداشتن

ابتدا سے ڈرنے والے دیکھ تو انجام بھی
ضبطِ غم سے پختہ ہو جاتی ہے طبعِ خام بھی

اس قدر بے چین کیوں ہے کلفتِ ایام سے
کچھ تو شرما۔ اپنے جی ہی میں سکوتِ شام سے

سائے

ایسی راتیں بھی کئی گذری ہیں
جب تری یاد نہیں آتی ہے
درد سینے میں مچلتا ہے مگر
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے
ہر گناہ سامنے آ جاتا ہے
جیسے تاریک چٹانوں کی قطار
نہ کوئی حیلۂ تیشہ کاری
نہ مداوائے فرار!

ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پہ
جب تری رہگذر میں سائے
ہر جگہ چار طرف، تھے چھائے!
تو نہ تھی، تیری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے، لرزاں لرزاں
کبھی آتے کبھی بھاگے کبھی بھاگے کبھی آئے!-
سائے ہی سائے- تری راہگذر کے سائے!-
ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پہ
جب تری یاد نہیں آتی ہے
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے!

مزدور کا گیت

چکی پیسو، روٹی کھاؤ اپنی محنت کا پھل پاؤ
ہندو مسلم سب چھوٹے ہیں لاینحل ہیں یہ الجھاؤ!
ان جھگڑوں میں تم مت آؤ
چکی پیسو، روٹی کھاؤ!!

۲

حسن کی دنیا، حسن کی دولت عیش و عشرت ناز و نعمت
خسرو اور فرہاد کو دیکھو لاحاصل ہے عیش میں محنت
خون پسینے پر نہ بہاؤ
چکی پیسو، روٹی کھاؤ!!

(۳)

ہندی کا ہو، ہندی آقا   اچھا صاحب! پھر کیا ہوگا!

وہ کیا ہم سے کام نہ لے گا   کام کی جب اجرت ہے پھر کیا!

کام کرو اور خوب کماؤ

چکّی پیسو، روٹی کھاؤ!

(۴)

نہ ایسے ہیں نہ ویسے ہیں   یہ لیڈر بھی ہم ایسے ہیں

ان کو بھی ہے پیٹ کا دھندا   ان کا مقصد بھی پیسے ہیں

ان کی باتوں میں مت آؤ

چکّی پیسو، روٹی کھاؤ!!

○

سرمایہ داری

ہندو کیا ہیں، مسلم کیا ہیں، جھوٹی ذاتیں پاتیں ہیں
سب دولت کے الجھاؤ ہیں سب دولت کی باتیں ہیں
مندر گرجے اونچے اونچے جگمگ جگمگ کرتے ہیں
اور عبادت کرنے والے بھوکے ننگے مرتے ہیں
تعمیریں ہیں خیراتیں ہیں حج اور تیرتھ ہوتے ہیں
یوں دامن سے خون کے دھبے دولت والے دھوتے ہیں

مذہب کیا ہے؟ راہگذر ہیں اک منزل کو جاتے ہیں
پنڈت مُلّا آپ بھٹک کر اوروں کو بھٹکاتے ہیں

روسی ہیں یا افریقی ہیں، ہندو یا عیسائی ہیں
دولت کے برچھوں کے زخمی سارے بھائی بھائی ہیں

یہ تعریفیں یہ تقسیمیں سرمائے کی گھاتیں ہیں
گورے کالے سب اُس کے ہیں جسکے دن اور راتیں ہیں

○

شہری اور دہقانی

ہم سچے خادم قوم کے ہیں ہم خلق کی خدمت کرتے ہیں
ہم اپنا دامن خالی کر کے سب کی جھولی بھرتے ہیں

جب شہری اپنے کمروں میں پنکھوں کی ہوائیں لیتے ہیں
ہم خون پسینہ اک کر کے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں

جب شہر کے باسی سوتے ہیں جب طائر نغمے گاتے ہیں
ہم ہانک کے اپنے ڈھوروں کو گاؤں سے باہر جاتے ہیں

ہل جوت کے ہم جب جاتے ہیں دھرتی کی خاک اڑاتے ہیں
ہم موٹے تن سے محنت کر کے دانہ دانہ پاتے ہیں

جب جنگ کا ڈنکا بجتا ہے جب ملک پہ آفت آتی ہے
یہ سینہ ننگا ہوتا ہے یہ چھاتی گولی کھاتی ہے

میدان میں باھر آ کر ہم تلوار پہ قبضہ کرتے ہیں
کمروں میں دبکے رہنے والے کمروں ہی میں مرتے ہیں

یہ سب کچھ ہے یہ سب کچھ ہے ہم یونہی جان گنواتے ہیں
جب مال غنیمت بٹتا ہے سب کچھ شہری لے جاتے ہیں

○

دہقان کا مستقبل

کڑکتی دھوپ میں کھیتوں میں دہقاں ہل چلاتا ہے
پسینہ بن کے خون ہر موئے تن سے بہتا آتا ہے

بدن پر برچھیاں بن بن کے کرنیں شعلہ افگن ہیں
ابھی سے درپئے آسودگی یہ برقِ خرمن ہیں

خمیدہ آنکھ، تن بے پیرہن، تصویرِ مظلومی
سراپا درد و حرماں فکرِ کلفت رنج محرومی

یہ سب کچھ ہے یہ سب کچھ ہے مگر دیکھو انی ہل کی
زمیں کے سینۂ ہموار کو ہے چیرتی جاتی

اڑے آتے ہیں انگاروں کی طرح خاک کے تودے
ابھی تھے اور نہیں ہیں ایک دم میں جھاڑیاں پودے

مگر روئے زمیں سے خستہ تن ہے قلبِ دہقاں کا
کہ ہے آماجگہہ صدیوں سے ظلم و جورِ انساں کا

یہ ایسا کھیت ہے تلوار کا ہل جس میں چلتا ہے
لہو کے مینہ میں برچھی بن کے ہر خوشہ نکلتا ہے

یہ بنجر کھیت غیر آباد، دل خاموش دہقاں کا
طلب رکھتا ہے خوشوں کی تمنائی ہے باراں کا

یہ دونو ہاتھ مضبوطی سے جو تھامے ہوئے ہیں ہل
یہ خاموشی سے چلنے والے پاؤں غیر متزلزل

یہی آزاد کروائیں گے آقاؤں سے بندوں کو
یہ پاؤں روندلیں گے سرکشوں کو سربلندوں کو

یہ ہل ہموار کر دیں گے بلندی اور پستی کو
یہ مستعمر بدل ڈالیں گے ویرانی میں بستی کو

نظر آتے ہیں تودوں کی طرح شاہی محل مجھ کو
دکھائی دیتے ہیں ارض و سما میں ہل ہی ہل مجھ کو

○

شاہ اور گدا

ایک شہر کا بازار ہجوم خلائق والیٔ شہر کی آمد آمد۔ ایک گرد آلود اجنبی یہ سب
کچھ حیرت سے تک رہا ہے ایک شہری سے مخاطب ہوتا ہے۔

اجنبی — "قبائے اطلسی پہنے ہوئے یہ کون آتا ہے۔"؟
شہری — یہ اس بستی کا والی ہے یہ ہم لوگوں کا داتا ہے
یہ ہم سب پر حکومت کرنے والے کی سواری ہے
اجنبی — سواری؟ — کیا یہ خود معذور ہے چلنے سے عاری ہے۔؟

شہری —— نہیں یہ بادشاہ ہے باغ میں گلگشت کرتا ہے

غریبوں کی طرح بازار میں کب پاؤں دھرتا ہے

اجنبی —— وہ کیا ہے۔؟

شہری —— "...... تخت ہے۔"

اجنبی —— .... وہ کون پہنچے ہیں۔؟

شہری —— کہاں پر؟

اجنبی —— .... تخت کے نیچے۔

شہری —— .... وہ کاندھا دینے والے ہیں۔"

اجنبی —— یہ انسان ہیں۔؟

شہری —— .... یہ انسان ہیں۔

اجنبی —— ..... یہ انسان ہیں؟ ۔ یہ انسان ہیں۔

(اجنبی ابھی تک بے تعلقی سے سوال کر رہا تھا مگر اب اس کی آواز جذبہ سے

معمور ہو رہی ہے۔ شور خلائق میں بلند ہو رہی ہے۔ شہریوں پہ اس کا بے حد

اثر ہوتا ہے)

اجنبی — یہاں حیوان نہیں ہوتے۔؟

شہری — یہاں انسان حیوان ہیں۔

اجنبی — "یہ ہم جنسوں کو حیواں کرنے والا کون ہوتا ہے۔

یہ انسانوں کو دکھ دے دے کے سکھ کی نیند سوتا ہے۔

یہ تم لاکھوں کروڑوں پہ اکیلا راج کرتا ہے۔

اسے آباد کرتا ہے اسے تاراج کرتا ہے۔

شہری — یہ ہم لوگوں کے بل بوتے پہ اس بستی کا والی ہے۔

اجنبی — تو پھر "داتا" یہ کیسے ہو گیا ؟۔ ادنیٰ سوالی ہے۔

یہ تمغہ سرخ جو اس کی قبا میں یوں چمکتا ہے۔

یہ وہ خوں ہے کہ جو مزدور کی رگ سے نکلتا ہے۔

یہ اطلس - یہ قبا - یہ تخت - یہ سامان عشرت کے -

یہ زرّیں تاج - یہ قصرِ معلےٰ - ڈھیر دولت کے -

یہ سب مزدور کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے -

یہ شانِ کبریائی کب ہے اندازِ گدائی ہے -

(سواری بالکل مقابل آجاتی ہے اور شہری مل کر والی کو تخت سے اتار لیتے ہیں - اطلسی قبا تار تار کر دیتے ہیں -)

اجنبی اور شہری - اسے کیوں بادشہ - کس واسطے فرمانروا کہئے -

گداؤں کا گدا ہے یہ - گداؤں کا گدا کہیئے ،

○

غریبوں کی صدا

غریبوں کی فاقہ کشوں کی صدا ہے
مرے جا رہے ہیں
امیروں کے عیشوں کا انبار سر پر
لدے ہیں زمانے کے افکار سر پر
زمیندار کاندھے پہ سرکار سر پر
مرے جا رہے ہیں
شرابوں کے رسیا امیروں کا کیا ہے
ہنسے جا رہے ہیں

غریبوں کی محنت کی دولت چرا کر
غریبوں کی راحت کی دنیا مٹا کر
محل اپنے غارت گری سے سجا کر
ہنسے جا رہے ہیں
غریبوں نے سمبندھ مل کر کیا ہے
خوشی بڑھ گئی ہے کہ غم بڑھ رہے ہیں
نگاہوں سے آگے قدم بڑھ رہے ہیں
سنبھلنا امیرو کہ ہم بڑھ رہے ہیں
بڑھے جا رہے ہیں !

○

مان بھی جاؤ

مان بھی جاؤ، جانے بھی دو، چھوڑو بھی اَب پچھلی باتیں
ایسے دِن آتے ہیں کب کب، کب آتی ہیں ایسی راتیں

مان بھی جاؤ، جانے بھی دو

وہ دیکھو پُورب کی جانب، نُور نے دامن پھَیلایا ہے،
رات کی ظُلمت دُور ہوئی ہے، سُورج واپس لَوٹ آیا ہے

مان بھی جاؤ، جانے بھی دو

جل جل کر مر جانے والے پروانوں کا ڈھیر لگا ہے
لیکن یہ بھی سوچا تم نے شمع کا کیا انجام ہُوا ہے

مان بھی جاؤ، جانے بھی دو

○

ایک نظم کے تین بند

اب میری دوستی سے ہے انکار آپ کو!
کیوں کہہ دیا ہنسی میں "ستم گار" آپ کو؟
لڑنے کو اک بہانہ تھا درکار آپ کو
مَیں اِس سے روکتا نہیں سرکار آپ کو
اچھا جو شوق ہو تو بگڑ کر بھی دیکھ لو
یہ بھی، تمھیں قسم ہے مرے سر کی دیکھ لو

○

مَیں آج سے جو عِشق جتاؤں گناہگار
افسانہائے ہجر سُناؤں گناہگار
یُونہی سہی جو بزم میں آؤں گناہگار

تم کو جو اپنی شکل دکھاؤں گناہگار

ہاں ہاں قصور وار، گنہگار میں سہی
جو کچھ نہیں ہیں آپ، وہ سرکار میں سہی

○

ہو تم جو شاہِ حسن تو شاہِ سخن ہوں میں،
ہو تم جو بے مثال تو یکتائے فن ہوں میں
محسودِ روزگار ہوں فخرِ زمن ہوں میں
اے گلعذار! باعثِ رنگِ چمن ہوں میں
میں عشقِ لازوال کا آئینہ دار ہوں
جس پر کبھی نہ آئے خزاں وہ بہار ہوں

○

کارزار،

لمبی لمبی پلکوں کے
گہرے گہرے سائے میں
سنسان فضائیں بستی ہیں!
ویران نگاہیں بستی ہیں

★

لمبی لمبی پلکوں کی
تیکھی تیکھی نوکوں سے
شبنم ہار پروتی ہے
کیا جگمگ جگمگ ہوتی ہے!—

★

گھری گھری پلکوں کی
اونچی اونچی دیواریں ہیں —
ترچھی ترچھی نظروں کی
اوچھی اوچھی تلواریں ہیں ! —

دیواریں گِر گِر پڑتی ہیں
تلواریں ٹوٹ جاتی ہیں ! —

○

تعمیرِ خانہ

وہی اچھی تھی گھر کی ویرانی
دُشمنِ عشرتِ تن آسانی

در و دیوار دیو اژدر تھے
بام اِک بیشۂ نیستانی

اب گریباں گلے کا پھندا ہے
کیا فراغت تھی وائے عُریانی

دِل کو چھلنی کیا حوادث نے
وہی اچھے تھے تیر بارانی

وہم کے پیچ و تاب نے مارا
اب کہاں سیرِ سنبلستانی

گھر کو سمجھا تھا وجہ جمعیت
اور افزوں ہوئی پریشانی
ہے تخیّل بھی چار سو محدود
آپ اپنا ہُوا ہوں زندانی
دِل ہے اور اعتبارِ وعدۂ وصل
مَیں ہوں اور اپنے گھر کی دربانی
عقل نے سو طرح سے سمجھایا
عشق نے ایک بھی نہیں مانی!

جس کسی کو بھی تو پسند ہوا
خستہ و خوار دردمند ہوا

نیک و بد سب ہیں تیری محفل میں
میرے ہونے سے کیا گزند ہوا

میری ہر بات پر ہوئی نفریں
میرا ہر کام ناپسند ہوا

خاکساری پہ بھی ہے وہ مغرور
تیری نظروں میں جو بلند ہوا

میں ہوں وہ نغمہ خوانِ آزادی
قید ہونے پہ جو نہ بند ہوا

رہرو

آج میں دور۔ بہت دور۔ نکل آیا ہوں۔
بے طلب، بے تگ و دو
دل میں کاوش نہ تلاش
نہ کوئی خواہشِ مخفی نہ تمنائے معاش
ہوسِ خام نہ سودائے تمام!۔
یونہی چلتا ہوا۔ چلتا ہوا۔ آ پہنچا ہوں۔۔
پے بہ پے۔ گام بہ گام
کس قدر دور نکل آیا ہوں!۔

اس سے پہلے بھی چلا ہوں میں نئی راہوں پر

شاہراہوں سے پرے،

شہر و دیہات سے دور! —

خار زاروں میں گھسٹتی ہوئی اک سرخ لکیر

اک سسکتی ہوئی دلدوز نفیر! —

سرسراتے ہوئے ملبوس

مہکتی ہوئی سانس! —

لذت و کرب کا مدھم بم و زیر! —

آج لیکن میں بہت دور نکل آیا ہوں

اور اک شام ـ سرِ راہگذار

وہ مری لغزشِ پا ـ میری وہ بے راہ روی! —

خود فراموش ـ سبک دوشِ عمل

اپنے اجداد کے ناکردہ گناہوں کی عقوبت سے بری! —

اک ہرن چوکڑی بھرتا ہوا — خاموش خرام! —
شام کے وقت سرِ راہگزار
میں بہت دور بھٹک نکلا تھا۔
آج لیکن میں بہت دور نکل آیا ہوں

آپ سے آپ بہت دور۔ بہت دور۔ نکل آیا ہوں
شاہراہوں سے پرے۔ دور گزرگاہوں سے
بے طلب، بے تگ و دو
خانقاہوں سے الگ، دور صنم خانوں سے
ہوسِ خام نہ سودائے تمام
یونہی چلتا ہوا۔ چلتا ہوا۔ آپہنچا ہوں
پے بہ پے۔ گام بہ گام! —
کس قدر دُور۔ بہت دُور۔ نکل آیا ہوں۔

دوراہا

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان - الٰہی توبہ! —
نہ مروّت، نہ تکلف، نہ تبسم نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش
بے ارادہ ہے تو کیا غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقامانہ تحکم کی نمود

خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اک اظہارِ بغاوت بھی تو ہے
یونہی یونہی سہی
اک شائبۂ دادِ شجاعت بھی تو ہے
———— (چاک تو کرتا ہوں میں، اپنا گریباں ہی سہی")

× × × × ×

کلبلاتی ہوئی مخلوق کی اس دلدل میں
سینہ تانے ہوئے، کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے، پھن پھیلائے! ——
لوگ، وہ لوگ نہیں
جن کو ٹھکراتے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ، بڑے صاحب لوگ! ——

یہ جو حکام ہمارے ہیں یہ حکام نہیں
جو ہمیں سے ہیں مگر ہم میں نہیں
یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
باوفا ہوں تو ہوں بیدام نہیں! —
—(''تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا'')

× × × × ×

ان پہ دنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگِ گراں حائل ہے
کہ اٹھائے نہ اٹھے اور ہلائے نہ ہلے! —
دوسرے درجے کے دروازے میں
ان کے آقاؤں کا اک فرد۔ فرنگی گورا
باہیں پھیلائے ہوئے، راستہ روکے ہے کھڑا
—(''کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق!'')

سیٹیاں بجنے لگیں خدمتِ سرکار بجا لانا ہے

اور سرکار ہی خود سنگِ رہِ منزل ہے! —

زندگی آ گئی دوراہے پہ! —

دیر کیوں کرتے ہو بھاگو بھاگو

دوڑ کر تھرڈ کے ڈربے میں گھسو

اپنے ہم جنس غلاموں میں ملو

زندگی آ گئی دوراہے پہ! —

○

انسان

اجنبیت کا کچھ احساس تھا اور
ریل گاڑی کا سفر! ہچکولے ! ———
شور! — ایسا کہ خزاں میں جیسے
کسی درّے سے ..... کوئی
شاعرانہ سی مثال آپ تصور کر لیں ! ———
[— شور کا زور تو خود
شور کے لفظ سے ہی ظاہر ہے !] ———
آبشاروں کی طرح ، تند شراروں کی طرح ———
جب یہ حالت ہو تو پھر

بات کرنے کو کوئی اپنی زباں کیا کھولے! ـــــ
اور اگر ایسی ہی مجبوری ہو
تو فرنگی سے، سفر میں، ـــ باتیں،
یہ تو مر جائے تو پھر بھی نہ کسی سے بولے!

× × × × ×

جی میں آتا ہے کہ کچھ کھائیے اور سو رہئے!
نیند کیا آئے گی
یونہی میں نے اپنی آنکھوں کو ذرا بند کیا لیٹ گیا
اور پھر اُٹھ کے کھڑا ہو گیا، پھر لیٹ گیا
ریل کا شور رکھچا کھچ کھچ کھچ
اور گاڑی میں خموشی جیسے
میں ہی میں ہوں، نہ خدا ہے نہ رسول! ـــــ

یہ فرنگی بھی تو انسان ہے مجھ جیسا ہے

مگر اس کے ہیں نرالے ہی اصول! —

یہ مشینوں کی فضاؤں میں پلا پوسا ہے! —

مگر انسان ہے مجھ جیسا ہے! —

——— ریل کے شور سے یہ بھی تو پریشاں ہوگا

مگر اس کے ہیں نرالے ہی اصول

یہ مشینوں کا پلا پوسا ہے

مگر انسان ہے مجھ جیسا ہے! —

× × × × ×

اُس نے بھی میری طرح

اپنی آنکھوں کو ذرا بند کیا، لیٹ گیا

اور پھر اٹھ کے کھڑا ہو گیا، پھر بیٹھ گیا

ریل کا شور کھچا کھچ کھچ کھچ

اور گاڑی میں خموشی جیسے

....

یہ فرنگی بھی تو انسان ہے مجھ جیسا ہے

گو مشینوں کا پلا پوسا ہے! ———

تجربہ ہی سہی دیکھوں تو سہی

یہ بھی انسان ہے؟ - مجھ جیسا ہے؟

× × × × ×

میں نے پوچھا کہ کدھر جاؤ گے؟

اس نے پوچھا کہ کدھر جاؤ گے؟

اس نے کچھ مجھ سے کہا، میں نے بھی کچھ اس سے کہا

اجنبیت کا کچھ احساس نہ تھا

نہ یہیں ہندی وہ فرنگی، نہ وہ آقا ہیں غلام! ــــ

یونہی بے سود پرائی باتیں

یونہی ہر روز کی، یونہی، باتیں

جیسے گاڑی کا سفر ــ ہچکولے

کبھی دائیں کبھی بائیں

کبھی آگے کبھی پیچھے! ــــ

یہ فرنگی سہی۔ انسان ہے۔ مجھ جیسا ہے +

وہی سگرٹ وہی سوڈا وہی وسکی وہی پیاس

وہی خوشیاں، وہی غصّے، وہی حسرت وہی یاس

وہی گاڑی، وہی گاڑی کا سفر ــ ہچکولے!

ایک جھٹکا جو لگا، دھم سے گری ہیٹ، لبالب ساغر

ایسا چھلکا کہ شرابور ہوئے سب کپڑے

پا بہ سر! — جیسے کہ بگلے نے لگا کر ڈبکی
جھیل کی سطح سے سر اپنا نکالا ہو ابھی —
سر کے بالوں کو وہ ہاتھوں سے
مسکراتا ہوا کھسیانا سا —

میں نے بے ساختہ اک قہقہہ یوں برسایا
جیسے گھنگھور گھٹاؤں میں کڑکتی ہوئی رعد! —
اور اس قہقہے کی گونج میں سب ختم ہوئے
ریل گاڑی کا سفر
ہچکولے
ریل کا شور کھچا کھچ کھچ کھچ! —
دو نوں انسانوں کے ان قہقہوں سے ختم ہوئے
اجنبیت کے سب احساس

مذاہب کا نفور

رنگ اور نسل کا عفریت

حکومت کا شعور! ——

اور —— ان سب سے کئی درجہ زیادہ مسموم

وہ غلامانہ خودی —— خودداری،

وطنیت کا غرور!

نہ میں ہندی، وہ فرنگی! نہ وہ آقا میں غلام!

دونوں انسان ہیں

انسان ہیں!

انسان ہیں ہم! ——

○

سنہری دیا

سنہری دیا جھلملانے لگا ہے
پَرِ افشاں ہیں سائے
کہ دریا پہ جیسے
ہوائیں، رِدائیں
سیاہ، قرمزی سے کنارے
ابھرتی سی لہریں دمکتے سے دھارے
سنہری دیا جھلملانے لگا ہے! —
کہ جیسے کسی سرمئی فاختہ کے
کلیجے میں چبھ جائیں سونے کے کانٹے

نہ مژگاں نہ بازو نہ پر پھڑپھڑائیں
مگر ہلکی ہلکی سی آہیں کہ دریا پہ جیسے ہوائیں،
سنہری دیا جھلملانے لگا ہے!—

سنہری دیا جھلملانے لگا ہے۔
ہوا ہے مخالف مگر کچھ نہیں ہے
سنہری دیے پر اثر کچھ نہیں ہے
جو دشمن ہے بیرونِ در۔ کچھ نہیں ہے
سنہری دیا جھلملانے لگا ہے۔
کہ بتی کے بل سب کے سب کھل گئے ہیں،
کہ روغن کے قطرے جو تھے آنسوؤں کی طرح
پھوٹ کر بہہ رہے ہیں!—
سنہری دیا جھلملانے لگا ہے!

○

مناجات

میں نے یوں خواب میں دیکھا ہے کہ کل رات کہیں   کوئی رو رو کے یہ کرتا تھا مناجات کہیں

اے خدا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

التجا، عرضِ تمنّا، میں کروں یا نہ کروں

بے نیازی تری اک شان ہے اے ربِّ جلیل   اِک نئی شان ہر اک آن ہے اے ربِّ جلیل[1]

بندہ نادان ہے، انسان ہے، اے ربِّ جلیل

تو بتا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

---

[1] کل یومٍ ھو فی شان

اک اشارہ ترا یہ دہر ہے، مَیں جانتا ہوں — بحرِ تخلیق میں اک لہر ہے مَیں جانتا ہوں

لطف کیا چیز ہے کیا قہر ہے، مَیں جانتا ہوں

تیرے جلووں پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

ترے محبوب نبی تھے ذکریا، یحییٰ — ایک تیروں سے چھدا دوسرا آرے سے چرا

تو نے غیروں سے نہیں اپنوں سے کیا کیا نہ کیا!

اے خدا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

یہ تو افراد تھے اقوام پہ کیا کیا گذری — آلِ عمران بنی سام پہ کیا کیا گذری

اور تو اور خود اسلام پہ کیا کیا گذری

اے خدا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

اب فقط دہلی و بغداد کے افسانے ہیں — بستیاں مٹ گئیں ویرانے ہی ویرانے ہیں

شمعیں افسردہ، سسکتے ہوئے پروانے ہیں

اے خدا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

تیرے بندوں نے بنائی ہے نئی اِک دنیا ہو کے برباد بسائی ہے نئی اِک دُنیا
پھر ترے سامنے آئی ہے نئی اِک دُنیا
اب بتا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

× × × × ×

مَیں نے مانا کہ بہت سے غرباء ہوتے ہیں اور فرعون صفت کچھ امراء ہوتے ہیں
یہ جو یُوں بیٹھے ہیں جیسے کہ خدا ہوتے ہیں
ان سے جمہوریت لیں گے کسی دن یا رب ان کو معقول سزا دیں گے کسی دن یا رب
آج تقدیر نے کچھ اور طرح ڈالی ہے یعنی کشمیر نے کچھ اور طرح ڈالی ہے
ایک ہی کشتی میں زاہد بھی گنہگار بھی ہیں تیرے محبوب بھی ہیں تیرے خطاکار بھی ہیں
ڈرنے والے بھی شہادت کے طلبگار بھی ہیں
یہ بتا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

× × × × ×

اے خدا تجھ کو قسم ہے ترے دیوانوں کی　　تیرے محبوب کے انوار کے پروانوں کی

قوم کی راہ میں مر جانے کے ارمانوں کی

یہ بتا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں

× × × × ×

غازیوں کی، شہدا کی، میں قسم دیتا ہوں　　جن کے گھوڑوں کے سموں کی تو قسم کھاتا ہے[1]

تجھے محبوب خدا کی میں قسم دیتا ہوں　　جسے لولاک[2] کا مصداق تو ٹھہراتا ہے

یہ بتا تجھ پہ بھروسہ میں کروں یا نہ کروں"

× × × × ×

اک ندا آئی کہ بس اور مناجات نہ کر　　آہ و فریاد سے برہم یہ حسیں رات نہ کر

کچھ سمجھ سوچ بھی تو یونہی سوالات نہ کر

یہ بتا اپنے پہ تجھ کو ہے بھروسہ کہ نہیں　　میں تو تیرا ہوں مگر تو بھی ہے میرا کہ نہیں؟

[1] والعادیات ضبحًا　　[2] لولاک لما خلقت الافلاک

حضرت قائدِ اعظم کے حضور میں

ریاضِ عرش کی زینت ہے آشیاں تیرا
تیری نوا کے مناسب ہے گلستاں تیرا

فضائے عرشِ معلّٰے میں شاد کام ہے تو
بقدرِ ہمت عالی، فلک مقام ہے تو

مقامِ اوج پہ تکمیل ذات کرتا ہے
خدائے عرش سے کسبِ صفات کرتا ہے

تیرے جہاں میں زمان و مکاں کی قید نہیں
یہاں کی قید نہیں ہے وہاں کی قید نہیں

کبھی یہاں کا بھی آیا ہے پر خیال تجھے؟
ملائکہ نے کہا ہے ہمارا حال تجھے؟

تیرے طریق پہ چلتا ہے کارواں تیرا؟
ہمارے ملک میں ہے کوئی رازداں تیرا؟

○

پیامِ اقبال

شاعر

عقل کے پیچ و تاب میں غرق سفینۂ حیات موت تو خیر موت تھی آج حیات ہے ممات
سو گئے سب فسانہ گو کھو گئے راہ، راہرو رات کو دن نہ کر سکے دن کو بنا دیا ہے رات
حسن کی بارگاہ میں آنکھ ہے ناصبور ابھی قلب ہے بے حضور ابھی ذات ابھی ہے بے صفات

عشق نہیں ہوس سہی، نور نہیں تو آگ ہو
کچھ تو ہما ہمی رہے سست ہے نبضِ کائنات

اقبال

یہ تو نظر کے پاس ہے یہ نہیں تیری کائنات / یہ جو خرد کا وہم ہے یہ نہیں حدِّ ممکنات

آج کے غم کو بھول جا کل کی امید چھوڑ دے / تیرا زماں بھی بے ثبات تیرا مکاں بھی بے ثبات

وصل ہے شوق کا زوال رہزنِ راہ منزلیں / تیرا مقام بے سکوں، تیرا سفر تری حیات

راہ بھی راہبر بھی تو، نقش بھی نقش گر بھی تو / تجھ سے شہودِ بیّنات تجھ سے وجودِ محکمات

شاخِ نہالِ سدرہٴ، خار و خسِ چمن مشو
منکرِ او اگر شدی، منکرِ خویشتن مشو"

لندن کی ایک شام

یہ رہگزر

یہ زن و مرد کا ہجوم یہ شام

فرازِ کوہ سے جس طرح ندّیاں، سر پہ

لئے ہوئے شفق آلود برف کے پیکر

سفید جھیل کی آغوش میں سمٹ جائیں! —

یہ تند گام سبک سیر کاروانِ حیات

"نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم"

کدھر سے آئے کدھر جا رہے ہیں کیا معلوم! —

سنہری شام میں

اِیروس جھلملاتا ہُوا

بندھا ہوا ہے نشانہ، کھنچی ہوئی ہے کماں

کسے یہ تیر لگے گا

کہاں؟ یہاں کہ وہاں!—

نظر نظر سے ملی دل کا کام ختم ہُوا

بس ایک دَور میں یہ خُم تمام ختم ہُوا

سنہری شام میں

ایروس جگمگاتا ہے

کوئی ہنسے کوئی روئے یہ مسکراتا ہے

---

[۱] ای رَوس (EROS) عشق کے دیوتا کا مجسمہ جو لندن کے مشہور چوک پکاڈلی سرکس، میں استادہ ہے۔

اسی مقام پہ پھر لوٹ کر میں آیا ہوں

یہ راہ گزر، یہ زن و مرد کا ہجوم یہ شام
یہ تند سیر سبک گام، کاروانِ حیات
یہ جوشِ رنگ، یہ طغیانِ حُسن کے جلوے :
یہیں کے نُور سے روشن مری نگاہیں ہیں
مرے شباب کی روندی ہوئی یہ راہیں ہیں ! —

وہی مقام ہے لیکن وہی مقام نہیں
یہ شام تو ہے مگر وہ سنہری شام نہیں
وہ رعب داب نہیں ہے وہ دھوم دھام نہیں
وہ میں نہیں ہوں کہ ان کا میں اب غلام نہیں !
صنم کدوں میں اجالے نہیں رہے کہ جو تھے
کہ اب وہ دیکھنے والے نہیں رہے کہ جو تھے

غزلیات

متفرقات

○

بگذر ز شام رفتہ و بیا بہ صبحگاہی
کہ ہنوز یک دو ساغر ز مئے شبانہ دارم

○

هوس کیا آرزو کیا مدعا کیا — فریبِ عشق کے ساماں ہیں کیا کیا
کروں وحشت میں عرضِ مدّعا کیا — مجھے کہنا تھا کیا کچھ کہہ دیا کیا
پرانا چاہنے والا ہوں، مجھ سے — تکلف سازئ ناز و ادا کیا
انہیں لازم ہے دشمن کی خبر لیں — ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
حریفِ چشمِ عاشق ہو تو جانوں — پسِ پردہ ہے یہ شرم و حیا کیا

نہیں تاثیر اچھا۔ مَیں نے مانا
مگر ایسا بھی ہے آخر بُرا کیا

○

کہیں ہو جائے مجھ کو دسترس گر تیرے داماں تک
تو یکسر ایک کر دوں چاک دامن سے گریباں تک

بس اب اے چارہ گر اس چارہ فرمائی کو رہنے دے
پہنچ جائے گا خود یہ درد بڑھتے بڑھتے درماں تک

ابھی تک عشق تاویلِ ستم میں آپ کوشاں ہے
ابھی نوبت نہیں آئی فریبِ عہد و پیماں تک

مجھے اس وصل سے فرقت کی تلخابی ہی بہتر تھی
کہ اب باقی نہیں مینائے دل میں دُردِ ارماں تک

اسی کا نام صحرا ہے یہی وحشت کی بستی ہے
یہی اک دو گرہ کا عرض دامن سے گریباں تک

○

حُسن کیا ہے ایک پرتو ہے تری تنویر کا
معصیت کیا ہے مگر سایہ اِسی تصویر کا

مٹ گیا آخر، برا ہو نالۂ شبگیر کا
وہ جو تھا اک رابطہ تعزیر سے تقصیر کا

حُسن اک حربہ ہے کاری وار ہے تقدیر کا
عاشقی حیلہ ہے اک سرلشکرِ تدبیر کا

طرز یہ تخئیل کا، اسلوب یہ تحریر کا
چھپ نہیں سکتا چھپائے سے بیاں تاثیر کا

آنکھ اب تک دیکھتی ہے لب ترے ہلتے ہوئے
کان لیتے ہیں مزا اب تک تری تقریر کا

میرے دم سے اک جنوں آباد ہے زندانِ عشق
خندۂ وحشت اِدھر شیون اُدھر زنجیر کا

میرے دل کی آگ جا لپکی جہنّم کی طرف
ورنہ میں قائل نہ تھا تقصیر بے تعزیر کا

مدعائے شرحِ دردِ دل ہے شرحِ دردِ دل
آہ کرتا ہوں مگر طالب نہیں تاثیر کا

○

هوس نہ عشق، کسی سے نہیں قرار مجھے
ملے بھی وہ تو رہا ان کا انتظار مجھے

کہیں یہ تیرا ستم ہی کرم نہ ہو جائے
مری وفا سے نہ کر اتنا شرمسار مجھے

مری طرف وہ نگہ اس طرح اٹھی، سرِ بزم
کہ اپنے آپ پہ آنے لگا ہے پیار مجھے

تری نگاہ، تو تیری نگاہ ہے لیکن
ترے کہے کا بھی اب تو ہے اعتبار مجھے

یہ ڈر ہے قافلے والو، کہیں نہ گم کر دے
مرا ہی اپنا اٹھایا ہوا غبار مجھے

مرے لئے کہ عدو کے لئے ہے اذنِ حیات
وہ خواب میں نظر آئے ہیں سوگوار مجھے

○

قتلِ عاشق پر وہ کہتے ہیں کہاں کیونکہ ہوا — یہ کوئی پوچھے کہ دامن خونچکاں کیونکہ ہوا

یہ کسے معلوم ہے اے جلوۂ نیرنگ تو — مہرباں کیونکہ ہوا نامہرباں کیونکہ ہوا

مجھ سا بیکس کون ہوگا تو جفا پیشہ سہی — یہ ستم تجھ سے مگر اے آسماں کیونکہ ہوا

اے تری قدرت سے غافل زاہدِ شب زندہ دار — اک صبوحی نوش تیرا رازداں کیونکہ ہوا

پھول سے ہلکی طبیعت تھی ترے تاثیر کی
خاطرِ نازک یہ وہ بارِ گراں کیونکہ ہوا

○

بہت اچھا کیا رسوا کیا جو مجھ کو محفل میں
سمجھتا تھا میں اپنے آپ کو کیا جانے کیا دل میں

وہی سازِ حقیقت نغمۂ اوّل تھا کُن جس کا
نوا ریزی اسی کی ہے مرے ٹوٹے ہوئے دل میں

مرے پہلو میں آ کر ناز وہ کیا کیا نہیں کرتے
مچلتا ہے سمندر جس طرح آغوشِ ساحل میں

مرا قاتل تڑپنا دیکھ کر مجھ کو یہ کہتا ہے
یہ بیتابی پسند آتی نہیں ہے ہم کو بسمل میں

تڑپنا لوٹنا، بے تابیاں دونوں طرف یکساں
وہی انداز بسمل میں وہی انداز قاتل میں

اثر اظہارِ الفت کا نمایاں ہو گیا آخر
مجھے وہ گالیاں تاثر دیتا ہے مگر دل میں

○

مدعائے نظرِ اہلِ وفا رہنا تھا　　　نام کو ہی سہی پابندِ جفا رہنا تھا

پس کے خوں ہو کے بھی قدموں سے لگا رہنا تھا　　　مجھ کو رہنا تھا تو مانندِ حنا رہنا تھا

طور یہ شوق فزا چشمکِ پنہاں کیسی؟　　　پردہ منظور تھا تجھ کو تو چھپا رہنا تھا

دل میں موہوم سی امیدِ وفا رہتی ہے　　　یعنی کچھ دن تمہیں سرگرمِ جفا رہنا تھا

نام اچھوں میں نکل جاتا تو اچھے رہتے　　　تجھ کو ظالم ابھی پابندِ وفا رہنا تھا

نا امیدی اثر ہی سے سہی پر تاثیر

تجھ کو ہر حال میں راضی برضا رہنا تھا

(بر طرح بیخود دہلوی)

ختم ہوا، مے نہ ہوئی، مے ہوئی، ساغر نہ ہُوا
ایک دن بھی تو ہمیں عیش میسّر نہ ہُوا

عاشقی ہی سہی، خواری کی بھی حد ہوتی ہے
داورِ حشر کو قصّہ مرا باور نہ ہُوا

شکوۂ جور پہ یہ رنج، یہ غصّہ، یہ عتاب
خیر گذری کہ ترے ہاتھ میں خنجر نہ ہُوا

عیب تو کوئی نہیں مجھ میں بظاہر تاثیرؔ
پھر مرا دوست وہ کیا دل میں سمجھ کر نہ ہُوا

○

(بہ طرح داغؔ)

انہیں ہے مجھ سے محبّت کسی کو کیا معلوم
کسی کے دل کی حقیقت کسی کو کیا معلوم

کیا کریں وہ بظاہر عتاب کی باتیں
انہیں ہے مجھ سے محبّت کسی کو کیا معلوم

بہت مزے ہیں میں سنتا ہوں حکمرانی میں
یہ جو ہے لطفِ اطاعت کسی کو کیا معلوم

یہ مست مست سی آنکھوں میں نیچی نظروں میں
بھری ہوئی ہے شرارت کسی کو کیا معلوم

○

اے سکوتِ شاعری پروردۂ آغوشِ صبح
گوہرِ اسرارِ نو، آویزۂ در گوشِ صبح

سیلِ خور سے ہو رہا ہے اک جہاں سیرابِ نور
لو چھلک آیا ہے آخر ساغرِ سرجوشِ صبح

نغمۂ طائر شکستِ رنگ کی آواز ہے
تھی تلاطم گاہ جلوہ وسعتِ خاموشِ صبح

سبزۂ خوابیدہ جامِ خور سے تھا مسرورِ رنگ
شام کو انگڑائیاں لینے لگا مے نوشِ صبح

آئینہ پردازِ نیرنگِ تجلّی ہے کہ ہے
سُرخیِ شامِ شفق پروازِ رنگِ ہوشِ صبح

تیرگیِ گور کو سمجھا تھا میں انجامِ کار
دامنِ شب میں کشادہ ہے مگر آغوشِ صبح

عارضی جذبات کا ہیجان ہے تاثیر یہ
پھر وہی ہم ہیں وہی ہنگامِ ناؤ و نوشِ صبح

بے خود اس درجہ بناتی ہے تمنا ان کی
کہ رقیبوں کا ہے کچھ خوف نہ پروا ان کی

دلِ بے حوصلہ نے وہم میں ڈالا کیا کیا
ورنہ ایسی تو نہ تھی رنجشِ بے جا ان کی

دل میں جو کچھ ہے انہی کا ہے ہمارا کیا ہے
آرزو ان کی طلب ان کی تمنّا ان کی

رہِ تاریک چمک اُٹھے گی برقِ دل سے
آپ ہی راہ نما ہو گی تمنا ان کی

○

خاص مقدار بھری جاتی ہے پیمانے میں
فکرِ فردا وہی دنیا ہی ہے میخانے میں

جل گیا شمع پہ احسان کیا ہے ورنہ
کوئی کم سوزشِ باطن نہ تھی پروانے میں

نہ تو پروا ہے کسی کی نہ مروّت نہ لحاظ
تیرے انداز ہیں سارے ترے دیوانے میں

رقص کرتی ہے شرارت کی ہنسی آنکھوں میں
مے چھلکتی ہے لرزتی ہوئی پیمانے میں

نہ سنا جاتا ہے اُن سے نہ رہا جاتا ہے
دل ربا درد ہے ایسا مرے افسانے میں

یادِ احباب جدائی میں بہت آتی ہے
مجھ کو محفل سے سوا لطف ہے ویرانے میں

o

عمر بھر ہم انقلابِ آسماں دیکھا کیے
دشمنوں کا لطف جورِ دوستاں دیکھا کیے

کشتگانِ یاس وقتِ نزع کچھ کہتے تو کیا
دیر تک چپ چاپ سوئے آسماں دیکھا کیے

کون کہہ سکتا ہے کس امید پر لیکن یہ ہے
مرنے والے جانبِ در بے گماں دیکھا کیے

کس طرح صیّاد پھیلاتا رہا دامِ فریب
سہمے، سمٹے ہم اسیرِ آشیاں دیکھا کیے

اے سرابِ عقل! دشمن لے گئے درِّ مراد
اور ہم ساحل پہ ہی سود و زیاں دیکھا کیے

چشمِ نرگس وش نے پیمانہ کو مینا کر دیا
گُل کو گلشن کر دیا قطرہ کو دریا کر دیا

کون وہ پردہ نشیں تھا جس کا جب آیا خیال
حسرت وارماں نے میرے دِل میں پردا کر دیا

کِس کا جلوہ تھا کہ دِل ہے محوِ حیرت آجتک
کیا تماشا تھا کہ اِک عالم تماشا کر دیا

خواہشِ چاکِ گریباں تیرا منت کش ہُوں میں
ایک مشتِ خاک تھا میں مجھ کو صحرا کر دیا

○

(یہ اشعار ایک سہیلی ناز آفریں گاتی ہے جو عبدالرحمٰن کی مجوسی بیوی سے مخاطب ہے ....)

گلشنِ حسن میں پھر آج بہار آئی ہے جلوۂ یار طلب گارِ تماشائی ہے

کیا ہے: جوبن پہ جوانی اگر اترائی ہے شرم بھی حسن کی اک شانِ دل آرائی ہے

دھل گیا خاطرِ نازک سے غبارِ کلفت رخِ روشن پہ نئے سر سے بہار آئی ہے

شانۂ بادِ صبا، آئینۂ شبنم صبح حسنِ گل کے لئے سامانِ خود آرائی ہے

اُبھرے جوبن کا تقاضا ہے کہ ہو نے دو نمود
نیچی نظروں کا تقاضا ہے کہ رسوائی ہے

(اس کا جواب شیریں دیتی ہے جو اپنے بیاہ سے ناخوش ہے)

اپنے بیگانے ہوئے میرے وہ بیکس ہوں میں حسن میرا مرا دشمن ہے وہ بے بس ہوں میں

زندگی کیا ہے سمندر ہے، تلاطم افزا
اس کے گرداب فنا خیز میں اک خس ہوں میں

○

فریبِ جلوۂ نیرنگیِ جہاں مت پوچھ
ہم اُن کو بھول گئے ان کی جستجو کرتے

نصیحتوں سے جنوں ہو گئی پریشانی
یہ داغ پھیل گیا اور شست وشو کرتے

سوالِ دید یہ آغازِ عشق میں کیسا
ذرا کلیم سنبھل کر تو گفتگو کرتے

معاف : کاوشِ سعیِ تلاشِ یار کہ اب
گذر رہی ہے یونہی عمر آرزو کرتے

○

ساقی علاجِ لغزشِ مستانہ کیا کرے
فرزانے کا یہ حال ہے دیوانہ کیا کرے

رو رو کے غم نصیب نے کاٹی تمام رات
اب شمع اور ماتمِ پروانہ کیا کرے

ہو جس کا مدعا فقط اک سجدہ گاہِ شوق
وہ امتیازِ کعبہ و بت خانہ کیا کرے

وحشت پہ میری عرصۂ صحرا ابھی تنگ ہے
تو ہی بتا کہ اب ترا دیوانہ کیا کرے

محفل میں ان کو دیکھ لیا اک نظر سہی
اب اس سے بڑھ کے جرأتِ رندانہ کیا کرے

دشمن پہ اس عتاب نمائی کا مدعا
تاثیر تم سے عرضِ تمنا نہ کیا کرے

○

ہر چند انکسار کا قائل نہیں ہوں میں
کہتا ہوں پھر بھی ترے قابل نہیں ہوں میں

تجھ پر عیاں ہے سب مری خاموشیوں کا حال
تو خوب جانتا ہے کہ سائل نہیں ہوں میں

پھر کیا جو آ گرا ترے قدموں پہ مثلِ گرد
تیری سبک روی میں تو حائل نہیں ہوں میں

ہاں شعلہ ہائے عشق میں دودِ ہوس بھی ہے
ہوں چشم و گوش بھی ہمہ تن دل نہیں ہوں میں

احساس کو سراب بھی ہے چشمۂ بقا
اے ساربان، رہروِ منزل نہیں ہوں میں

وہ رودِ شور ہوں جسے صحرا نگل گیا
پابندِ وقفہ ہائے مراحل نہیں ہوں میں

کچھ بھی نہیں مگر ترے قدموں کی خاک ہوں
سب کچھ بھی ہوں مگر ترے قابل نہیں ہوں میں

داغ سینے پہ جو ہمارے ہیں
گل کھلائے ہوئے تمہارے ہیں

ربط ہے حسن و عشق میں باہم
ایک دریا کے دو کنارے ہیں

عشق کی روئداد ؛ خط نہ پیام
بس نگاہوں کے کچھ اشارے ہیں

تم ہمارے نہیں - نہیں - نہ سہی
ہم تمہارے ہیں ہم تمہارے ہیں

کوئی جدّت نہیں حسینوں میں
سب نے نقشے ترے اتارے ہیں

تیری باتیں ہیں کس قدر شیریں
تیرے لب کیسے پیارے پیارے ہیں

حلقہ زن چاند ہے ترے در پہ
رہگذر میں تری ستارے ہیں

جس طرح ہم نے راتیں کاٹیں ہیں
اس طرح ہم نے دن گذارے ہیں

میرے دل میں دبی ہوئی ہے آگ
شعر میرے نہیں شرارے ہیں

○

شکوۂ بے جا کی کیا اُن سے شکایت ہم کریں
کچھ تو ہیں پہلے ہی برہم اَور کیا برہم کریں

وُہ توجہ دیں تو ہو آراستہ بزمِ حیات
وہ نگاہیں پھیر لیں تو انجمن برہم کریں

یُوں بدل لیں طالعِ خورشید سے بختِ سیاہ
آسماں کی طرح سر کو تیرے در پر خم کریں

آئینہ دارِ نمودِ حسنِ روز افزوں جو ہو
ہم کہاں سے روز پیدا اک نیا عالم کریں

آگہی سرچشمۂ رنج و الم تا ثیر ہے
ہم خوشی سے ہی نہیں واقف تو پھر کیا غم کریں

میں بار بار کہتا ہوں، ہاں مُسکرا لیجئے
تم سے خفا ہیں، تم سے خفا ہیں، خفا ہیں ہم

ہم جان سے گئے سو بلا سے، کسی کو کیا
بارے تمہیں یقین تو آیا خفا ہیں ہم

یک رنگ چاہئے کہ طبیعت ہو عشق ہیں
ہم سے خفا جو تم ہو تو تم سے خفا ہیں ہم

ہم ہوش میں ہیں خاکِ کفِ پائے محتسب
ساغر اگر ہو سامنے اپنے خدا ہیں ہم

تاثیرؔ- وہ! درست! بڑے باوفا ہیں وُہ
ہم! ہاں- بجا کہا ہے! بڑے بے وفا ہیں ہم

○

پھر خون کی اک لہر اُٹھی دل سے جگر تک
پھر عشق کی روداد گئی دیدۂ تر تک

پھر اس نے دکھایا رخِ روشن، مہِ کامل
پھر رات کو دن ہم نے بنا ڈالا سحر تک

ایک ایک قدم پر ہے قیامت سی قیامت
میں جانتا ہوں پہنچا ہوں کیوں کر ترے در تک

پروانے کو بھی شمع کو بھی آگ لگی ہے
اب دیکھئے کیا حال ہو دونوں کا سحر تک

پھولوں میں، کبھی کانٹوں میں دو سُرخ لکیریں
جاتی ہوئی آتی ہیں نظر حدِ نظر تک

○

لطف جب چاہوں وہ سرگرمِ جفا ہوتا ہے
یوں بھی اک طرح سے میرا ہی کہا ہوتا ہے

تیری خاطر نہ سہی لذتِ بیداد سہی
دل میں رہ جاتا ہے جو تیر خطا ہوتا ہے

تیرے کعبہ میں تو اے شیخ ہے بس ایک خدا
میرے بُت خانے میں ہر ذرّہ خدا ہوتا ہے

مجھ کو تسلیم یہ الزام کہ ہرجائی ہوں
تیرا جلوہ بھی تو ہر آن نیا ہوتا ہے

مری آنکھوں کا کرشمہ ہے مرے دل کا فریب
وہ بھی میں ہوتا ہوں جو میرے سوا ہوتا ہے

منہ سے کچھ بولیں تو گستاخ بتائے جائیں
اور جو چپ رہیے تو اس کا بھی گِلا ہوتا ہے

تیری مرضی ہو تو تقدیر کا منشا معلوم
تو مخالف ہے تو تدبیر سے کیا ہوتا ہے

زرد رو چاند ہے لرزش میں ہیں تارے سارے
کون یوں پچھلے پہر نغمہ سرا ہوتا ہے

کوئی معنی ہوں جو شعروں میں تو مانوں تاثیر
یونہی لفظوں کے اُلٹ پھیر سے کیا ہوتا ہے

○

ہر ایک پھُول میں اک خاص دل فریبی ہے
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

تو بزمِ غیر میں آئے تو بے نقاب آئے
مَیں دامنِ نگہِ شوق کو نقاب کروں

نگاہِ گرم مجھی پہ سہی مگر سرِ بزم
تجھے تو شرم نہیں میں ہی کچھ حجاب کروں

میں خود گم کردہ خاکِ کفِ پائے تمنّا ہوں
مری ہستی وُہ دریا ہے جسے صحرا نگل جائے

مگر ٹوٹے ہوئے تھے اے تصوّر ہاتھ ہی تیرے
وہ نازک آئے اُور آغوش میں آکر نکل جائے

تاثیر ترے گریہ میں کیا خاک اثر ہو — جب دیکھئے آکر تمہیں با دیدۂ تر ہو

آواز میں لرزش ہو نہ دزدیدہ نظر ہو — یوں کیجئے الفت کہ انہیں بھی نہ خبر ہو

یا غیر کے ہو جائیے یا مجھ سے بسر ہو — یہ خوب تماشا ہے ادھر ہو نہ ادھر ہو

کوئی نہ ہو جس کو نہ غمِ دردِ جگر ہو — یہ دنیا مرے قبضۂ قدرت میں اگر ہو

مجھ پر جو تمہاری نگہِ مہر اثر ہو — ہر اشکِ تمنّا مری آنکھوں میں گہر ہو

دن رات ہے اُس زلفِ پریشاں کا تصوّر — اب دیکھئے کیونکر شبِ فرقت کی سحر ہو

بے لوث محبّت کو ہوس ناک نہ کر دے — مجھ پر نہ ہو، دشمن پہ عنایت کی نظر ہو

پھر ہوش کسے تفرقۂ پردازِ خودی کا

جب انجمن آرا وہ مرا کیفِ نظر ہو

بیٹھا ہوں میں فریب تمنا لئے ہوئے — دنیا میں ایک اور ہی دنیا لئے ہوئے

موسیٰ چلا ہے لرزہ براندام سوئے طور — ہر موئے تن میں ذوق تماشا لئے ہوئے

محراب میکدہ میں ہے ساقی جھکا ہوا — ساغر بدست دوش پہ مینا لئے ہوئے

ق

بیٹھا تو ایک فتنۂ دوراں بغل میں ہے — اٹھا تو ایک حشرِ تماشا لئے ہوئے

پروانہ جل کے دل کی مرادوں کو پا گیا — اور شمع رہ گئی رُخِ زیبا لئے ہوئے

آئے بھی وہ چلے بھی گئے بزم ناز سے — بیٹھا رہا میں دل میں تمنّا لئے ہوئے

جلنا تھا طور جل گیا موسےٰ کا کیا گیا — حضرت تو آ گئے یدِ بیضا لئے ہوئے

تاؔثیر میرے نام کا اقبال دیکھنا
اقباؔل بھی ہے میری تمنّا لئے ہوئے

(علامہ اقبؔال کے دو اشعار سے تلمیح ہے)

اقبؔال میرے نام کی تاؔثیر دیکھنا — مَیں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست

میں بلبلِ نالاں ہوں اس اجڑے گلستاں کا — تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

○

غمِ عالم سمٹ کر یا الٰہی دِل نہ بن جائے
یہ مشکل جو پرانی ہے نئی مشکل نہ بن جائے

یہ تارے گرد راہِ کارواں معلوم ہوتے ہیں
یہ منزل تھی مگر اب رہبرِ منزل نہ بن جائے

اٹھا کر پھینک دیں جانے کہاں طوفان کی لہریں
کہیں گرداب ہی میرے لئے ساحل نہ بن جائے

وہی بے تابیاں اس کی وہی بے باکیاں اس کی
یہ اب تک جو مرا دل تھا یہ تیرا دل نہ بن جائے

سمجھ جائے اگر تو بن کہے مَیں چپ رہوں لیکن
مجھے ڈر ہے مری مشکل تری مشکل نہ بن جائے

پھر دھندلکا سا ہوا، رات کے آثار گئے
جام و مینا کو سنبھالے ہوئے میخوار گئے

شمعیں گل ہو گئیں، پروانے گئے، بزم اٹھی
میں ہی میں رہ گیا سب انکے طرفدار گئے

یہ عجب مے ہے، عجب نشہ، عجب محفل ہے
کہ جو مدہوش یہاں آئے تھے ہشیار گئے

آنکھ سے آنکھ ملی، دل کی حقیقت معلوم
میرے سب حیلے بہانے یونہی بیکار گئے

آہ و فریاد گئی، آنکھ میں آنسو نہ رہے
غم بھی جاتا رہا تاثیر جو غم خوار گئے

○

محبّت کی تمنا ہے نہ سودا دوستداری کا
وفاداری کا دعوےٰ ہے نہ شیوہ استواری کا

یہ خمخانے یہ مینائیں انہیں رہنے دے اے ساقی
خمارِ جاوداں انجام ہے اس بادہ خواری کا

محبت اک چمن ہے ہاں مگر کیسا چمن جس میں
ہر اک غنچہ ہر اک پتا ہے تشنہ اشکباری کا

کماں خالی کمیں خالی۔ ہدف کس کا قفس کیسا
یہاں پر صید ہی صیاد ہے اپنے شکاری کا

اطاعت کی اجازت کیلئے بندے ترستے ہیں
نیا انداز ہے اس مملکت میں شہریاری کا

اسی کو ہجر کہتے ہیں اسی کو وصل کہتے ہیں
گزرتا ہے جو مے خوار پر لمحہ ہوشیاری کا

نئے زخموں سے پہلے زخم دب جائیں تو دب جائیں
نہیں جز دلفگاری کچھ مداوا دلفگاری کا

جوانی اس کو کہتے ہیں، جوانی ہی سہی اچھا
کبھی آیا تو تھا جھونکا اِدھر بادِ بہاری کا

خدائی ہے کہ کافر ماجرائی حسن والوں پر
جو چاہو نام رکھ لو عشق کی بے اختیاری کا

مجھے دیکھا تو ساقی نے صراحی اک طرف رکھ دی
بُرا تاثیر ہو اس شہرتِ پرہیزگاری کا!

○

فریب کار سے ہم بھی فریب کار بنیں
سوالِ وصل کریں محوِ انتظار نبیں

وہ آئیں بام پہ تو ہم تڑپ کے دکھلائیں
وہ بے قرار بنائیں تو بے قرار بنیں

گلوں سے دامنِ امیدوار بھر لائیں
جنوں نواز باندازۂ بہار بنیں

نیاز مند کو محوِ نیاز رہنے دیں
نہ دل فگار بنائیں نہ دل فگار بنیں

لذّتِ درد نے ممنونِ مداوا نہ کیا
وہ تو مائل تھے مگر ہم نے تقاضا نہ کیا

دل کو منظور تھی خونابہ فشانی لیکن
میری آنکھوں نے ترے راز کو رسوا نہ کیا

یہ جبیں خاکِ درِ یار سے رنگیں جو ہوئی
اِس کو کعبہ میں بھی آلودۂ سجدہ نہ کیا

مرتے دم بھی نہ اُٹھے دستِ دُعا جانبِ غیر
عشق کو ہم نے شریکِ غمِ دنیا نہ کیا

یہ تیری کم نگہی تھی کہ مری شدّتِ شوق
دل نے جو حوصلۂ عرضِ تمنّا نہ کیا

○

رات بھر جاگ کر تارے
سو گئے صبح کو تھکے ہارے

پاؤں میں آبلے ہیں منزل دُور
رہ گئے راستے میں بے چارے

نیلگوں چادروں میں ہیں روپوش
آسماں پر زمیں کے مہ پارے

حسن اور عشق کی لڑائی میں
جیت جن کی ہوئی وُہی ہارے

○

تیرے اندازِ تغافل کو حیا سمجھا تھا میں
جورِ پیہم کو بھی اک طرزِ وفا سمجھا تھا میں

تجھکو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں
اے فریبِ آرزو تم کیا تھے کیا سمجھا تھا میں

شیوۂ تسلیم تھا مجھکو مآلِ زندگی
تیری ہر خواہش کو اپنا مدعا سمجھا تھا میں

تشنہ کامانِ محبّت کی امنگیں کچھ نہ پُوچھ
انتہائے آرزُو کو ابتدا سمجھا تھا میں

زلف آوارہ، گریباں چاک، اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

بہار آئی تو بن آئی جنونِ محفل آرا کی
چمن والوں کے دم سے ہے یہ ساری دھوم صحرا کی

سزا ایسی کہ شاید آپ بھی اس کو سزا سمجھیں
خطا اتنی کہ اِن آنکھوں نے کیوں عرضِ تمنّا کی

مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گردن جھکا دینا
میں اس کو سادگی سمجھوں حیا سمجھوں کہ بیبا کی

یہ میرا خانماں برباد دل یہ ناشکیب آنکھیں
وگرنہ کون سی تھی شاخ جو میں نے نہیں تا کی

کھلے بندِ قبا بھی کشمکش لیکن رہی باقی
طبیعت میں حیا، آنکھوں میں شرم اور دل میں بیبا کی

مجھے دیکھا تو شرما کر وہ کچھ کھوئے گئے ایسے
کہ قسمت کھل گئی ہے میری چشمِ بے محابا کی

مرا ذوقِ نظر دیکھو کہ لاکھوں میں انہیں دیکھا
میرا دل، میری ہمّت دیکھنا، کِس کی تمنّا کی

محبت۔ دوستی، یہ آرزوئیں ہیں مری ورثہ
نہ دنیا کو مری پروا نہ پروا مجھ کو دنیا کی

جوانی اور حسن و عشق! قصہ مختصر یہ ہے — حیا۔ اِک نازِ بے پروا۔ محبت۔ اِک ہوسناکی

خطائیں کیں بہت سی کیں مگر تیرے سہارے پر — تمنا کی اگر میں نے تو تیری ہی تمنا کی

مجھے حاضر جوابی۔ حیلہ سازی۔ کیا نہیں آتا — حضورِ یار کام آئی نہ لیکن کوئی چالاکی

بخاری کی غزل نے مجھ کو اے تاثیر اکسایا
وگرنہ مجھ میں کب جرأت تھی اظہارِ تمنّا کی

○

مجھے پسند نہیں ہوش مند فرزانے
مَیں اور گوشۂ راغ اور چند دیوانے

یہ خوف ہے کہ نہ بیزار عشق سے کر دیں
سنا سنا کے انہیں دردمند افسانے

بجا ہے بستیوں والے کہیں جو دیوانہ
ہیں اہلِ ذکر کو جی سے پسند ویرانے

خزاں نہیں تو نمودِ بہار کچھ بھی نہیں — سرورِ بادہ بغیرِ خمار کچھ بھی نہیں

نہ نقشِ پا، نہ سراپردۂ حریمِ نیاز — بجز غبارِ سرِ رہگزار کچھ بھی نہیں

لہو بہائے کہ موتی، تری نظر جانے — بجائے خود مژۂ اشکبار کچھ بھی نہیں

وصال دامِ امید و فراق حیلۂ بیم — متاعِ عشق بجز انتظار کچھ بھی نہیں

یہ کائنات بھی، وہ کائنات بھی تیری — تو میرا اے مرے پروردگار۔ کچھ بھی نہیں

غضب کے رنگ، غضب کی تراش ٹھیک درست
بجا، مگر پسِ نقش و نگار کچھ بھی نہیں

○

اے حق سرشت آئینۂ حق نما ہیں ہم
اے ابتدائے کار تری انتہا ہیں ہم

تم کیا ہو؟ عشوہ کاریٔ تخئیل۔ اور کیا؟
ہم کیا ہیں؟ بازگشتہ تمہاری صدا ہیں ہم

ذہنِ ازل میں ایک تصوّر کا اہتزاز
مدھم سی ایک نغمۂ کن کی نوا ہیں ہم

کچھ بھی نہیں جو تو نہ ہو تو ہے تو کیا نہیں
سب کچھ بھی ہم ہیں اور جو سوچیں تو کیا ہیں ہم

آ۔ اے نقاب پوشِ ازل آ قریب تر
پردہ الٹ کے آ۔ کہ ترا مدّعا ہیں ہم

کیسی تلاشِ راہ کہ منزل میں آپ ہیں
کیسی رجا و بیم کہ خود مدّعا ہیں ہم

○

عشق کے رازِ نہاں شرحِ بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے دِل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھوں نے اُن سے کہدی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کہے دل سے ہوں دل کی باتیں
وائے وہ عرضِ تمنا جو زباں تک پہنچے

○

میری وفائیں یاد کرو گے — روؤ گے فریاد کرو گے

ہم بھی ہنسیں گے تم پر اک دن — تم بھی کبھی فریاد کرو گے

محفل کی محفل ہے غمگیں — کس کس کا دل شاد کرو گے

دشمن تک کو بھول چکے ہو — ہم کو تم کب یاد کرو گے

آکر بھی ناشاد کیا تھا — جاکر بھی ناشاد کرو گے

ختم ہوئی دشنام طرازی — یا کچھ اور ارشاد کرو گے

مجھ کو تو برباد کیا ہے — اور کِسے برباد کرو گے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں
کب تک اس کو یاد کرو گے

○

تیرے ہر جام کا یکساں ہے مزا اے ساقی
اب پلانی ہے تو کچھ اور پلا اے ساقی

وہی پیمانہ فروشی وہی قطروں کا شمار
وہی انداز پرانا ہے ترا اے ساقی

جاں بلب پیاس سے کوئی، کوئی بدمستی سے
کیا یہی مے ہے تری آبِ بقا اے ساقی

اب نئے رنگ کے میخوار یہاں آئیں گے
اب یہاں سے تو دکان اپنی بڑھا اے ساقی

اب یہاں سود و زیاں کا نہ تقاضا ہوگا
فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا ہوگا

عہدِ سلطانیِ جمہور کی ساعت ہے قریب
تو معزز جسے سمجھا ہے وہ رسوا ہوگا

یونہی رکھے ہوئے رہ جائینگے آدابِ رسوم
جانے اے پیرِ مغاں حشر ترا کیا ہوگا

کھیلی جائے گی نئے رنگ کی ہولی تا ثیرؔ
مے کشو، مژدہ! کہ جلدی یہ تماشا ہوگا

○

سفر کا لطف نہیں ہے بسطوت سالک
وہ راہ راہ نہیں ہے جو پیش پا آئی

نظر ملائی تو ہے تم نے جی کڑا کر کے
لو دیکھنا وہ نگاہیں جھکیں حیا آئی

نہ پوچھ جوشش تمنا کا انفعال نہ پوچھ
کہ غیر سے بھی مجھے بوئے آشنا آئی

یہ کس کے گیسوئے پیچاں کا سر میں سودا ہے
کہ پیچ کھاتی ہوئی باغ میں صبا آئی

○

مجھ کو بھی یاد نہیں آپ کو بھی یاد نہیں
ذکرِ بیداد میں اب لذتِ بیداد نہیں

نقش ممنونِ جگر کاوئ مژگاں نکلا
بے ستونِ معجزۂ تیشۂ فرہاد نہیں

اک نظر، ایک چمکتا ہُوا آنسو سرِ بزم
اور رودادِ محبّت مجھے کچھ یاد نہیں

یہ گلستان ہے کہ زنداں ہے کہ صحرا کیا ہے
کوئی بجلی نہیں، گلچیں نہیں صیّاد نہیں

یاد کرتا ہوں، تڑپتا ہوں مزے لیتا ہوں
ذکرِ بیداد مگر شکوۂ بیداد نہیں

کس نے، کب، کس پہ کیا ظلم یہ قصّہ کیا ہے
تم اگر بھُول گئے ہو تو مجھے یاد نہیں

مجھ کو گر قتل کیا، عمر کا قیدی چھوڑا
یہ کوئی ظلم نہیں، یہ کوئی بیداد نہیں

جو مرے دل میں ہے وہ کہتا ہوں بے ربط سہی
للہ الحمد کہ شاعر ہوں میں اُستاد نہیں

○

قفس ٹوٹا۔ بہار آئی یہ کیسا مجھ کو خواب آیا
چمن کا پتہ پتہ نعرہ زن ہے انقلاب آیا

نہ شرمائی ہوئی نظریں، نہ مرجھائے ہوئے چہرے
گلوں پر تازگی آئی گلستاں پر شباب آیا

نہ بلبل آشیانوں میں، نہ گلچیں صید گاہوں میں
چمن میں دوست دشمن جو بھی آیا بے نقاب آیا

گنہگاروں کی کثرت سے گناہوں کو بھی لے ڈوبی
وہ بستی ایک ہو کر مٹ گئی جس پر عذاب آیا

وہ شرمائے ہوئے آئے ذرا جھجکے ذرا سنبھلے
نظر بھر کر نہ دیکھا تھا کہ پھر ان کو حجاب آیا

خمار آلودہ ساقی۔ مغبچے بدمست اُف توبہ
قیامت ہے جو اس محفل میں اب دورِ شراب آیا

○

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ہم سخنی ہو، ہزار ہم نظری
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

حنائے ناخنِ پا ہو کہ حلقۂ سرِ زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ، وضو کے لئے سہی، لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں۔؟

○

وہ ملے تو بے تکلّف نہ ملے تو بے ارادہ — نہ طریقِ آشنائی نہ رسومِ جام و بادہ

تری نیم کش نگاہیں تیرا زیرِ لب تبسّم — یونہی اک ادائے مستی یونہی اک فریب سادہ

یہ دلیلِ خوش دلی ہے مرے واسطے نہیں ہے — وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا — مری آرزو سے کمتر مری تاب سے زیادہ

مرے دل نے خوب سمجھا جو کہا تری نظر نے — یہ ہوس کا ہے تقاضا کہ زباں سے ہو اعادہ

وُہ قدم قدم پہ لغزش وہ نگاہ مستِ بادہ
بہ طرازِ زلفِ سرکش بہ کلاہ کج نہادہ

لطفِ وفا نہیں کہ وہ بیدادگر نہیں
خاموش ہوں کہ میری فغاں بے اثر نہیں

ان کے بغیر تلخیٔ کام و دہن حرام
دردِ جگر ہے لذّتِ دردِ جگر نہیں

تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں

ہر ہر روش معاملۂ حسن و عاشقی
ہر ہر قدم فروغِ جمالِ نظر نہیں

بے باک چال، چال سے بیباک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں

سجدوں سے نامراد ہے جلووں سے ناامید
وہ رہگزر کہ اب جو تری رہگزر نہیں

دنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

زخموں سے چور قافلہ، پرخار راستے
اس میں ترا قصور تو اے راہبر نہیں؟

○

مجالِ صبر نہیں تابِ انتظار نہیں
وہ جائیں اب مجھے ان کا بھی اعتبار نہیں

کسی سے تیرا کوئی عہد استوار نہیں
میں بے قرار سہی تجھ کو بھی قرار نہیں

یہ اختیار میسّر کہ چاہتا ہوں تجھے
اور اس پہ جبر کہ تجھ پر کچھ اختیار نہیں

ستارے شمع بہ کف منتظر ہیں صف بستہ
یہ کہکشاں کہیں ان کا تو رہگذار نہیں

رکی رکی ہوئی باتیں جھکی جھکی آنکھیں
مگر یہ دل مرا اب تک بھی شرمسار نہیں

وہ تو کہ تیری ہنسی زہر خند ہے واعظ
یہ مے کہ تلخ ہے اور پھر بھی ناگوار نہیں

وہ تیرا اپنا فرشتہ، وہ دشمنِ آدم
میں کیا کروں کہ مجھے اس پہ اختیار نہیں

ترے کرم کی قسم تیری بخششوں کی طفیل
وہ پاک باز نہیں جو گناہ گار نہیں

قدم قدم پہ ہیں پھانسیں یہاں وہاں صیاد — بہار نام ہے کس کا جو یہ بہار نہیں

چمن تو پیشِ نظر ہے میں پر شکستہ سہی — یہ آشیاں تو ہے گو مجھ کو سازگار نہیں

بندھے ہوئے ہیں مراتب کچھ اس طرح کہ یہاں — ذلیل و خوار ہے وہ جو ذلیل و خوار نہیں

میں کچھ نہیں مرے اشعار کچھ نہیں تاثیرؔ
یہ سب طلب ہے ستائش کی انکسار نہیں

غیر کے خط میں مجھے اُن کے پیام آتے ہیں
کوئی مانے کہ نہ مانے مرے نام آتے ہیں

عافیت کوش مسافر جنہیں منزل سمجھیں
عشق کی راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں

اب مرے عشق پہ تہمت ہے ہوسکاری کی
مسکراتے ہوئے اب وہ لبِ بام آتے ہیں

واعظِ شہر کی محفل ہے کہ ہے بزمِ نشاط
حوضِ کوثر سے چھلکتے ہوئے جام آتے ہیں

بیدہِ شوق، رہِ عشق ہے اے اہلِ ہوس
منزلیں آتی ہیں اس میں نہ مقام آتے ہیں

اب نئے رنگ کے صیاد ہیں اس گلشن میں
صید کے ساتھ جو بڑھ کے تہِ دام آتے ہیں

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

جن کو خلوت میں بھی تاثیر نہ دیکھا تھا کبھی
محفلِ غیر میں اب وہ سرِ عام آتے ہیں

محبت ناصبوری بے قراری — محبت ، قہقہے ۔ فریاد و زاری
نہ ہونا ہو تو ترکش بے جراحت — جو ہونا ہو تو پہلا وار کاری
خرد نے ہاتھ پر تلوار روکی — جنوں نے گھونپ دی دل میں کٹاری
نگاہوں سے نگاہیں لڑ رہی ہیں — ابھی آئی نہیں ہے دل کی باری

کبھی نورِ یقیں آنکھوں میں روشن
جھلکتی ہے کبھی بے اعتباری

○

آگیا پھر آگیا، وہ شاہِ خوباں آگیا
جان میں جان آگئی وہ جانِ جاناں آگیا

آگیا وہ، جس کو تم سب کہہ رہے تھے بیوفا
ہاں وہی، وہ بے وفا، وہ زود پیماں آگیا

اس طرح آیا کہ اب تک اس طرح آیا نہ تھا
دست افشاں، پائے کوباں، چاک داماں آگیا

اس طرح آیا کہ جیسے پھر نہ جائے گا کبھی
شاداں شاداں خنداں خنداں رقصاں رقصاں آگیا

اس طرح آیا کہ جیسے کاروانِ فصلِ گل
یک گلستاں بر کف و صد گل بداماں آگیا

لوٹ آیا نور جیسے دیدۂ یعقوب میں
جیسے پھر کنعاں میں واپس ماہِ کنعاں آگیا

جیسے صحرا میں گھٹائیں جیسے اندھیارے میں چاند
رخ پہ بکھرائے ہوئے زلفِ پریشاں آگیا

خارِ گلشن عطر بیز و خاکِ گلشن لعل رنگ
صد بہار رنگ و نکہت میں وہ طوفاں آگیا

خارِ گلشن عطر بیز و خاکِ گلشن لعل رنگ   رود بارِ رنگ و نکہت میں وہ طوفاں آگیا
میکدہ برباد مے پینے وہاں جائیگا کون   جام بر کف جب یہاں وہ شاہِ مستاں آگیا
خانقاہوں کی ترقی، مسجدوں کی رونقیں   میرے گھر میں وہ عدوئے دین و ایماں آگیا

هوش میں آ، سر اٹھا نا شیر، آنکھیں کھول دیکھ
تیری آنکھوں کی قسم وہ شاہِ خوباں آگیا

○

دل ست بندهٔ احرار و جاں اسیرِ فرنگ   نه بهرهٔ همه صلح و نه چارهٔ همه جنگ

میانِ کعبه و بُت خانه عرصهٔ یک گام   میانِ شیخ و برہمن ہزار ہا فرسنگ

بہار آمد و آں حُسنِ نوبہار آمد   کجاست ساقیٔ گلفام و بادهٔ گلرنگ

صبا که خیمه به خمِ جوئبار می آید   بروے آب گشاد دست صفحهٔ ارژنگ

بیا که بادهٔ بنوشیم بر سرِ بازار   بیا که نغمه سرائیم با دف و نے و چنگ

"بیا که خاوریاں نقشِ تازه بستند"   بیا که باز ستاند افسر و اورنگ

نمود سر بسر اظہار و کوہکن یک تن
ہزار پیکرِ شیریں فسرده در رگِ سنگ

قطعات

و

متفرقات

نگار مست و خود از دست می رود این جا
ادب ز دست ندادن کمالِ بے ادبی ست

نمی کند که دلِ شیشه هم گداز کند
فغاں ز قطرۂ آبے که آتشِ عنبی ست

بیا و دفترِ حکمت بسوز و شعرم خواں
که با ملاحتِ هندی عذوبتِ عربی ست

○

جاؤ کہ اب وہ جوشِ تمنّا نہیں رہا — آنکھیں رہیں، یہ دیکھنے والا نہیں رہا
آبِ بقا بھی چشمِ خرد میں سراب ہے — میں تشنۂ فریبِ تمنّا نہیں رہا
تم آج بھی وہی ہو جو کل تھے بجا! درست! — بس وہ نہیں رہا، بہت اچھا نہیں رہا

○

یہ بھی رہے خیال ستانے کے ساتھ ساتھ — ہم بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ
رُک رُک کے ہو رہے ہیں ادا حرفِ معذرت — کچھ کچھ غرور بھی ہے بہانے کے ساتھ ساتھ

○

تم اپنے آپ کو کیا جانے کیا سمجھتے ہو — خدا نہیں تو کچھ اس سے سوا سمجھتے ہو
یہ منہ لبسور کے بیٹھے رہو گے یوں کب تک — اسے بھی حسن، اسے بھی ادا سمجھتے ہو

○

○

آئینہ پرداز نیرنگِ تجلّی ہے کہ ہے — سرخیٔ شامِ شفق پروازِ رنگِ ہوشِ صبح
تیرگیٔ گور کو سمجھا تھا میں انجامِ کار — دامنِ شب میں کشادہ ہے نگہ آغوشِ صبح

○

آخرِ کار جو انجام تھا میخواری میں — ہائے جو عمرِ ورع گذری زیاں کاری میں
ہم سے دیکھی نہ گئی غنچہ کی سینہ چاکی — تم کو کیا جانے مزا کیا ہے دل آزاری میں
ساقیٔ جامِ ازل پھر مجھے بے خود کر دے — کہیں سرزد نہ خطا ہو کوئی ہوشیاری میں

○

آدمی کر گذرے جو مقدور ہو — آگے جو اللہ کو منظور ہو
ایک خوبیٔ حسنِ بے پروا سہی — خیر اتنا بھی نہ تو مغرور ہو

○

○

لو آ گئی بہار کہ اُڑنے لگے ہیں پھر جو پر بچے کھچے تھے ابھی آشیانے میں
یارب یہ زندگی بھی بلا کی ہے دلفریب کیا رنگ بھر دیئے ہیں ذرا سے فسانے میں
کثرت میں جلوہ گر ہے وہی واحد الوجود سو رنگ اک کرن کے ہیں آئینہ خانے میں

○

اک کیفِ بے خودی ہے سراپا نمازِ عشق اخلاص کیا قیام و رکوع و سجود میں
اے بے خودیٔ شوق یہ کیسا مقام ہے ہلکا سا اک حجاب ہے بود و نبود میں

○

جنت کا ہر اک ہے اشتیاقی ساقی لا خم میں جو رہ گئی ہے باقی ساقی
تو بھی ہے یہاں شراب بھی ہے موجود جنّت ہے یہی شراب و ساقی۔ ساقی

○

○

نشیمن مرا گو ہوا نذرِ برق — چمن کے تو سر سے بلا ٹل گئی

کریں گے عدو سے اب اظہارِ عشق — یہ تدبیر تو ہے اگر چل گئی

○

عقل کی موشگافیاں عقدہ کشا نہ ہو سکیں

کیفیتیں جو دل میں تھیں لب سے ادا نہ ہو سکیں

منہ سے جو کچھ کہا تو کیا ضبط اگر کیا تو کیا

نالے اثر نہ کر سکے آہیں رسا نہ ہو سکیں

○

موسمِ گل ہے کہ طوفانِ نمو ہے یا رب

رخنے شاخوں نے کئے باغ کی دیواروں میں

○

○

محراب بلند اور شمعیں بہت اے دل ہیں عبادت خانوں میں
وہ نور وہ رفعت ان میں کہاں ہے جو کہ ترے ایوانوں میں
سامان بہت ہے شور بہت ہے سب کچھ ہے پر جوش نہیں
وہ نور نہیں ہے شمعوں میں وہ سوز نہیں پروانوں میں

○

اب مسافت تری محدود نظر آتی ہے
دیکھ وہ منزلِ مقصود نظر آتی ہے

○

چھایا ہے اک جہان پہ عالم نکھار کا
منہ دھل رہا ہے آج عروسِ بہار کا
تیوری جبیں پہ، بات میں سختی، نگہ میں قہر
بدلا ہوا مزا ہے مَے خوش گوار کا

○

○

سر پہ سفید بال ہیں یعنی سحر قریب ہے
خوابِ گراں کا زور ہے، وقتِ سفر قریب ہے

○

دل کی تھی ساز باز پہلے سے   دیکھ لینا تو اک بہانہ ہوا

○

وُہ میری رنجشِ بے جا پہ ٹھیک کہتے ہیں
ستم کا روز گلہ ہے، کرم کا نام نہیں!

○

بصحرائے محبّت با چنیں وحشت گذر کردم
بسے آشفتہ بود ایں قصّہ من آشفتہ تر کردم

○

○

پانی پہ پرفشاں ہے یہ موجِ نسیم یا
لہرا رہی ہے زلفِ شکن در شکن تری

میرا سوال، مجھ سے گدا کا، مُنے گا کون
جوبن ترا؛ شباب ترا؛ انجمن تری؛

○

کوئی بھی تو انیسِ دمِ بے کسی نہیں
اک سانس ہے سو وہ بھی کبھی ہے کبھی نہیں

○

گلچیں کے جور سے ہمہ تن داغدار ہوں
جس پر خزاں کو آئے ہنسی وہ بہار ہوں

اب ہو چکی وہ سعیٔ شب و روز ہو چکی
امیدوارِ گردشِ لیل و نہار ہوں

○

ساغر و مینا کی جب شادی رچائی جائیگی
دخترِ رز رقص کرنے کو بلائی جائے گی

اے دعائیں مانگنے والو دعا کا فائدہ؛
صبحِ محشر ہو گی جب شامِ جدائی جائیگی

○

○

○

کیسا مرنا کیسا جینا۔ یکساں ہے اب مرنا جینا
تنگ آیا ہوں میں اس رٹ سے مرنا، مرنا، جینا، جینا

قطعہ

مل گئی تجھکو اگر منزلِ لیلےٰ تو کیا
اور میں یونہی رہا بادیہ پیما، تو کیا،
جلوۂ طور بھی، اس نور کا اک سایہ ہے
تُو نے دیکھا بھی، تو کیا، مَیں نے نہ دیکھا تو کیا،

○

○

تو دل بھی ہے دل کی آرزو بھی منزل بھی ہے گرمِ جستجو بھی
اے عقدۂ کشائے رازِ ہستی! اس کُل کا ہے ایک جزو تو بھی

○

خوش بے حجابیوں سے ہوں اپنی یہ خو نہیں
نیچی کرو نگاہ یہ ہم ہیں عدو نہیں

○

آؤ ہم تم مل کے کھیلیں لیلیٰ و مجنوں کا کھیل
تم بنو جانِ تمنّا ہم تمنّائی بنیں
اُن کا دامن اور ہمارا دستِ شل جانے بھی دو
یونہی کیوں اظہارِ مطلب کر کے سودائی بنیں

○

○

بے خودی خیز ہے، اس درجہ، تمنّا، ان کی
کہ رقیبوں کا ہے کچھ خوف، نہ پروا، ان کی
دل میں جو کچھ ہے، انہیں کا ہے، ہمارا کیا ہے؟!
آرزو ان کی، طلب ان کی، تمنّا ان کی!!!

○

رازِ دنیا نہ کھول دیکھتا جا دیکھ منہ سے نہ بول دیکھتا جا
ہر چمک دار چیز اشک نہیں موتیوں کو نہ رول دیکھتا جا

○

سی بلقیس تاثیر نے انشا پریس لاہور سے چھپوا کر ۱۹۔ مسن روڈ لاہور سے شائع کیا